شیشہ و
سنگ
میرزا ادیب

شیشہ و سنگ

(دس کھیل)

میرزا ادیب

مکتبۂ کارواں، کچہری روڈ ۰ لاہور

ناشر ---------- چودھری احمد نجیب

طابع ---------- چودھری عبدالمجیب

مطبع ---------- کارواں پریس ۔ لاہور

بارِ اول ———— ۱۱۰۰

۱۹۷۹ء

قیمت ۲۱ روپے

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

سرآغاز

میرزا ادیب کی شہرت کا آغاز ہو چکا تھا جب اس بندۂ عاجز یعنی سرآغاز نگار نے اس دنیائے آب و گل میں قدم رکھا۔ اس لیے میں روایتی دیباچہ نگار کے انداز میں میرزا ادیب کو نہ تو متعارف کرانے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں اور نہ ہی فی الوقت اس کا محل ہے۔ علاوہ ازیں میرزا ادیب کے فن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کے "صحرانورد کے خطوط" اور "صحرانورد کے رومان" پر متعدد نقادوں نے صدائے آفریں بلند کی ہے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان پر بھی تنقیدی تحریریں کمیاب نہیں۔ خصوصاً ان کے بہترین افسانوں کا انتخاب مرتبہ پروفیسر عرش صدیقی اور اس پر ایک تفصیلی مقدمہ جانا پہچانا ہے اور مجھے اس کے بارے میں مزید قلم رانی کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح ان کے ڈراموں کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں اور پورے وقت کے ڈرامے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسے معتبر ناقدین تفصیلی مضامین لکھ چکے ہیں اس لیے میں یہاں تکرار کو ملال انگیز سمجھتے ہوئے ان تمام تفصیلات سے قطع نظر کرتا ہوں جو موقر ناقدین کے مضامین میں موجود ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس مجموعے کے تعارف تک محدود رکھوں گا جس کا نام میرزا ادیب نے "شیشہ و سنگ" تجویز کیا ہے۔

"شیشہ و سنگ" کے ڈرامے موضوع کے اعتبار سے تاریخی ڈرامے ہیں اور فن کے اعتبار سے دو شاخوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد ریڈیائی ڈراموں کی ہے اور دو

ڈرامے ایسے بھی ہیں جو علامہ اقبال کی دو مشہور نظموں یعنی "ذوق و شوق" اور "مسجدِ قرطبہ" سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعے کے اہم ترین ڈرامے ریڈیائی ڈرامے ہی ہیں۔ ان میں سے "شیشہ و سنگ" کا تعلق سرزمینِ دکن سے ہے۔ "سیّد احمد شہید" میں پیش کردہ واقعات صوبۂ سرحد میں پیش آتے ہیں۔ "سراج الدولہ" بنگال کا نواب تھا اور اس کے لہو نے اسی سرزمین کو سیراب کیا۔ "نجابت خان" جھجر کے نواب تھے اور ان ریاستوں کے نمائندے سمجھے جانے چاہئیں جنھیں انگریزوں نے پہلے اپنے زبردست پروپیگنڈے سے بدنام کیا اور بعدازاں اسی بدنامی کو جواز بنا کر اُن پر قبضہ کر لیا۔ "حضرت محل" اودھ کی سلطنت کی وہ قابلِ فخر ملکہ تھی جس نے انتزاعِ سلطنت کو کبھی دل سے قبول نہ کیا اور ناساعد حالات کے باوجود انگریزوں سے ٹکر لی۔ گویا ان تمام ڈراموں کا پس منظر ایک ہی ہے یعنی مسلمانوں کا ہندوستان اور ہندوستان میں مسلمان سلطنتوں کے آخری ایام۔ گو مسلمان حکومتوں کو ایک عیار دشمن نے مٹا دیا لیکن وہ مٹتے مٹتے بھی تاریخ کے دامن پر سُرخ لہو کے نشانات ثبت کر گئیں۔ ان میں پیش کردہ افراد المیہ کے ہیرو ہیں۔ ان میں دم خم تھا، توانائی تھی، مقصد کی لگن تھی۔ لیکن انھیں انتہائی ناساعد حالات سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ وہ حالات کو اپنے موافق نہ بنا سکے لیکن حالات سے بے جگری کے ساتھ لڑے اور میرؔ کے اس شعر کی مجسّم تصویر بن کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

المیہ کے یہ ہیرو بظاہر ناکام رہے لیکن ان کی ناکامیاں ان کی ذاتی اور شخصی خامیوں کے سبب وجود میں نہیں آئیں بلکہ وہ ایسے حالات کے بھنور میں پھنس گئے جہاں سے سلامت نکلنا ممکن ہی نہ تھا اور پھر ان کے اردگرد دشمن کے جاسوس لگے ہوئے

تھے۔ یہ خریدے ہوئے لوگ ہی ہر دَور میں مسلمانوں کی تباہی کا باعث بنے ؎

ہم نے جب کھائی ہے اپنوں ہی سے زک کھائی ہے

مسلمانوں کی تاریخ میں جتنے غدار ملتے ہیں اور کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملیں گے۔ کسی نے میر جعفر بن کر سراج الدولہ کو شہید کیا اور ساتھ ہی اپنے وطن کی قسمت پر بھی مہر لگادی۔ کوئی مہدی حسن اور یار محمد ہونے کے باوجود فرنگیوں کا زرخرید بنا اور ملک سے غداری کے صلے میں خود بھی تہی دامن دنیا سے رخصت ہوا اور غداروں کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسلامی تاریخ نے جتنے مجاہد پیدا کیے اس کی مثال بھی کسی اور قوم کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ میرزا ادیب نے ان ڈراموں میں تاریخ اسلامی کی روح کو جذب کر لیا ہے اور ایک طرح سے ان سب ڈراموں کو مجاہدوں اور غداروں کا تقابلی مطالعہ بنا دیا ہے۔

مشرقی ادب بالخصوص اسلامی ادب میں کردار نگاری کا تصور مغربی ادب سے مختلف ہے۔ ہماری داستانوں، مثنویوں، سوانح عمریوں وغیرہ میں ہمیشہ جو ہیرو پیش کیے جاتے رہے ہیں وہ ہمہ صفت موصوف ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ولن ہمیشہ بدیوں کے مجسمے ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دنیا میں مثالی شخصیتیں پیدا کی ہیں اور اس کا مطمح نظر مثالی شخصیتیں پیدا کرنا ہے اور مثالی شخصیتوں کا خاکہ پوری طرح سے ذہن نشین اس وقت ہو سکتا ہے جب ان کا تقابل شر کی قوتوں سے کیا جائے۔ ہمارے افسانوی ادب کے خالق ہمیشہ یہی کرتے رہے ہیں اور میں اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا اگر آج بھی کوئی فن کار اسی روایت سے اپنا چراغ روشن کرے۔ اس لحاظ سے میں میرزا ادیب کی کردار نگاری کو بہت اہم تصور کرتا ہوں۔

تاریخی ڈرامے لکھتے ہوئے میرزا ادیب نے نہایت مشہور واقعات بھی پیش کیے ہیں اور کم معروف واقعات کو بھی پیش کیا ہے۔ اسی طرح وہ کردار بھی لیے ہیں جنھیں

تاریخ نے مہرِ نیم روز کی طرح چمکایا ہے اور ایسے کردار بھی لیے ہیں جن پر تاریخی ہونے کا محض احتمال ہو سکتا ہے کہ ان کا ذکر کسی تاریخ کی کتاب میں موجود نہیں۔ تاہم معروف اور غیر معروف واقعات یا جانے اور ان جانے کرداروں کے انتخاب میں ہمیشہ ایک بات ملحوظ رکھی گئی ہے اور وہ ہے ڈرامائی تاثر۔ تاریخی ڈراموں میں اس قسم کا تاثر پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ تاریخی ڈرامے لکھنے والا اپنے آپ پر وہی پابندیاں محسوس کرتا ہے جو تاریخی ناول نگار پر عاید ہیں۔ اس لیے اگر وہ معروف کردار اور واقعات لیتا ہے تو تاریخ سے انحراف نہیں کر سکتا اور اگر غیر معروف کردار و واقعات سے ڈراموں کو سجاتا ہے تو تاریخ مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس مشکل کا حل میرزا ادیب نے یہ نکالا ہے کہ ایک ہی ڈرامے میں حقیقی اور تخیلی واقعات اور کرداروں کو ملا کر پیش کیا ہے، جس سے تاریخ کے تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں اور تخلیق کی شرائط کو بھی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔

ان ڈراموں میں متعدد مقامات ایسے آتے ہیں جہاں ڈرامہ صحیح معنوں میں ڈرامہ بن جاتا ہے خصوصاً سراج الدولہ، نواب نجابت خان اور حضرت محل پر لکھے ہوئے ڈراموں میں کئی مقامات اور بھی زیادہ ڈرامائی، پُراسرار اور پُرتاثیر بن گئے ہیں۔

مثلاً

آمنہ : بیٹا رات کے وقت تو یہاں کیا کر رہا ہے؟

سراج الدولہ: کچھ نہیں، ٹہل رہا ہوں۔

آمنہ : اس بیتابی کا کیا سبب ہے؟

سراج الدولہ: اس کی وجہ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا۔

آمنہ : تو مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ اپنی ماں سے کیا چھپائے گا۔ مجھے بتا اس بیتابی کی وجہ کیا ہے؟

سراج الدولہ: میں سو رہا تھا۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے میرا دایاں ہاتھ کھینچ لیا

ہے۔ مَیں اسی وقت اُٹھ بیٹھا۔

آمنہ : کون تھا وہ؟

سراج الدولہ: کوئی نہیں تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔

آمنہ : کبھی پہلے بھی ایسا ہُوا تھا؟

سراج الدولہ: صرف ایک مرتبہ۔ اور یہ آج سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ مَیں دیر تک باغ میں گھومتا رہا تھا اور پھر وہیں روش پر سو گیا تھا۔ اُس وقت ایک ہاتھ نے زور سے میرا ہاتھ کھینچا تھا اور میں اسی طرح بیتاب ہو کر اُٹھ بیٹھا تھا۔

آمنہ : اس وقت بھی تیرے پاس کوئی نہیں تھا؟

سراج الدولہ: نہیں اماں جان! اس وقت تو نانا جان نے میرا ہاتھ کھینچ کر کہا تھا "اُٹھ جاگ بیٹا! کہاں سو رہا ہے"۔ مجھے محسوس ہوتا ہے آج بھی انھوں نے ہی میرا ہاتھ کھینچا ہے۔

حقیقی واقعے کو تصوّر کے ساتھ کس خوبصورتی سے ملایا ہے۔ یہ سراج الدولہ کا وجدان ہے جو اسے آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور ڈرامائی منظر ملاحظہ ہو۔ اس میں خواب کے منظر نے یہی تاثر پیدا کیا ہے لیکن دونوں مناظر کا انداز کتنا مختلف ہے!

ماں : حالات بگڑ گئے ہیں اور برابر بگڑتے جا رہے ہیں۔ رات سے میرا دل بُری طرح دھڑک رہا ہے۔

نواب : کیوں اماں جان؟

ماں : رات میں نے بڑا خوفناک خواب دیکھا ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ آسمان کے ایک کنارے سے ایک پرندہ اُڑنے لگا ہے اور جیسے جیسے نیچے آتا جاتا ہے اس کے بازو پھیلتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہمارے محل کے اُوپر پہنچتا ہے تو ہر طرف

اس کے سیاہ پر چھا جاتے ہیں۔ اور ان سیاہ پروں سے اُف میرے اللہ!.....

نواب : ان سیاہ پروں سے کیا ہوتا ہے اماں جان؟

ماں : ان سے لہو کے قطرے گرنے لگتے ہیں.... سُرخ سُرخ قطرے۔

یہ خوفناک خواب اُس صورتِ حال میں مکمل نفسیاتی جواز رکھتا ہے۔

یہ مثالیں اور اس قسم کی دوسری ڈرامائی کیفیات میرزا ادیب کے ڈراموں کو سادگی کے ساتھ ساتھ گہرائی عطا کرتی ہیں۔ میرزا ادیب کا فن بظاہر سادہ ہے۔ جملوں کی سادگی اور پلاٹ کی سادگی کو جانچنے کے لیے زیادہ توجہ کی بھی ضرورت نہیں۔ سادگی کا عنصر ہر جگہ موجود ہے مگر جس چیز کی طرف توجہ فوری طور پر منتقل نہیں ہوتی، وہ یہ ہے کہ یہ سادگی بڑی ہی پُرکار ہے۔ تاہم اس پرکاری کو محسوس کرنے کے لیے ان ڈراموں کو ریڈیو پر سُننا ضروری ہے۔ نشر ہونے پر یہ اپنی بہت سی ایسی خصوصیات کو بے نقاب کرتے ہیں جو محض مطالعے سے سامنے نہیں آتیں۔ اُس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح میرزا ادیب کے سٹیج ڈرامے سٹیج کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے نشری ڈرامے نظامِ اصوات میں احسن طریقے سے ڈھل جاتے ہیں اور یہی ان کی کامیابی، مقبولیت اور تاثر کا راز ہے۔

غرض میرزا ادیب کے نشری ڈراموں کا یہ مجموعہ اُردو کے نشری ڈراموں میں ایک نہایت اہم اضافہ ہے۔ عصرِ حاضر میں میرزا ادیب اور ڈراما لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص جدید اُردو ڈرامے کا ذکر کرے اور میرزا ادیب کا نام ذہن میں نہ آئے۔ اُردو ادب میں "من تو شدم تو من شدی" کی ایسی درخشاں مثالیں کمیاب ہیں۔

فہرس

شیشہ و سنگ

کردار:-

مارکیڈو ——

کیپٹن —— بحری جہاز کا کیپٹن

یوسف خاں ——

سلطان —— بیجاپور کا حکمران

راجہ —— وِزیانگر کا حاکم

اعظم رُشدی ——

عائشہ ——

ستوتی ——

سدی حسن ——

ان کے علاوہ

راجہ کے ملازم

O

منظر: جہاز کا عرشہ ۔۔۔

(گوا کے ایک بہت بڑے تاجر مارکیڈو کا سامان سے لدا ہوا جہاز پرتگال کے ساحل کی طرف رواں دواں ہے۔ معمول سے ذرا تیز ہَوا جو بتدریج بڑھتی جائے گی۔ مارکیڈو اور کیپٹن گفتگو کر رہے ہیں)

مارکیڈو : (لہجے میں پریشانی) کیپٹن! اِدھر دیکھ رہے ہو؟

کیپٹن : دیکھ رہا ہوں!

مارکیڈو : وہ جہاز کتنی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔

کیپٹن : جناب! یہ بات مَیں آپ سے پہلے محسوس کر چکا ہوں کہ بحری ڈاکوؤں کی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئی ہیں۔

مارکیڈو : تو ہم کیا کریں، تم کیپٹن ہو، میرے جہاز کو بچانا تمہارا فرض ہے۔

کیپٹن : جہاز کو بچانا میرا فرض ہے اور مَیں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس جہاز میں گوا کے ایک بڑے تاجر مارکیڈو کا سامان بھرا ہوا ہے۔ مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس فرض کی تکمیل میں کوئی غفلت نہیں کروں گا۔

مارکیڈو : تم نے اب تک کیا کیا ہے؟

کیپٹن : مسٹر مارکیڈو! مجھے صبح سویرے ہی پتا چل گیا تھا کہ ڈاکوؤں کا جہاز ہمارے تعاقب میں ہے۔ آپ کو معلوم ہے جہاز کی رفتار تیز ہو چکی ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہَوا کا زور بھی بڑھتا جا رہا ہے کہیں طوفان آ گیا تو ہم بالکل بے بس ہو جائیں گے۔

مارکیڈو : میرے وطن کا ساحل تو ابھی بہت دُور ہے۔ یہ لوگ تو برابر ہمارا

پیچھا کر رہے ہیں۔

کیپٹن: دیکھیے مسٹر مارکیڈو! آپ مدت سے تجارتی سامان لا رہے ہیں، آپ کو ابھی تک اس حادثے سے دوچار نہیں ہونا پڑا جسے بحری ڈاکوؤں کا حملہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت سفاک اور ظالم ہوتے ہیں، ہر حملے میں میں نے جو طریقہ اختیار کیا تھا، وہی آج بھی کروں گا۔ موجودہ صورت میں اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

مارکیڈو: اس سے جہاز بچ جائے گا؟

کیپٹن: جہاز اور وہ سب لوگ جو اس وقت جہاز میں موجود ہیں، بچ جائیں گے۔

مارکیڈو: اور میرا سامان؟

کیپٹن: یہ نہیں بچ سکتا۔

مارکیڈو: کیپٹن! میرا سامان لٹ گیا تو میں تباہ ہو جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا۔

کیپٹن: انسانی زندگی مال و اسباب سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

مارکیڈو: کیپٹن! جہاز کو کہیں اور لے جاؤ، کسی ملک میں، کسی جزیرے میں، کہیں بھی لے جاؤ، جہاں ہم ان کے حملے سے بچ جائیں، رفتار تیز کر دو، وہ آ گئے ہیں۔

کیپٹن: میں جو کچھ کر سکتا تھا کر رہا ہوں۔

(کہیں قریب ایک دھماکہ ہوتا ہے)

مارکیڈو: اوہ! توپ کا گولہ!

کیپٹن: یہ ڈاکوؤں کی طرف سے چیلنج ہے۔

مارکیڈو: چیلنج؟

کیپٹن: انہوں نے یہ چیلنج کیا ہے، جہاز روک لو ورنہ ....

مارکیڈو: ورنہ کیا؟

کیپٹن: دوسری صورت میں مقابلہ، قتل و غارت، آتش زنی، کشت و خون۔

مارکیڈو : اوہ، میرا سامان، میری زندگی؟

کیپٹن : مارکیڈو! بتاؤ اس چیلنج کا کیا جواب دیا جائے؟

مارکیڈو : رفتار تیز کر دو۔

کیپٹن : تم پاگل ہو گئے ہو۔ سمندر میں طوفان آ رہا ہے۔

مارکیڈو : کیپٹن! میں تمہیں مالا مال کر دوں گا۔

کیپٹن : میں کہتا ہوں جواب دو، ابھی ان کا جہاز قریب آجائے گا، گولوں کی بارش شروع ہو جائے گی، وہ لوگ کود کر یہاں آجائیں گے، تمہارے سامان کے لیے میں جہاز کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

مارکیڈو : مقابلہ نہیں ہو سکتا؟

(ایک طرف سے یوسف آتا ہے)

یوسف : مقابلہ ہوگا۔

کیپٹن : تم کون ہو؟

یوسف : یوسف خاں، مارکیڈو کا خادم۔

کیپٹن : تم نیچے جاؤ، ہٹو یہاں سے، ایک خادم بحری ڈاکوؤں سے مقابلہ کرے گا؟ (حقارت آمیز قہقہہ) چلے جاؤ۔

یوسف : کیپٹن! میں کہتا ہوں مقابلہ ہوگا۔

کیپٹن : مارکیڈو!

یوسف : مالک! کہیے مقابلہ ہوگا، آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔

کیپٹن : مارکیڈو! مارکیڈو! وہ لوگ آگئے

مارکیڈو : میں اپنا سب کچھ کھو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔

(طوفانی شور بڑھ جاتا ہے، توپوں کی گرج، بندوقوں کی گولیوں کی باڑ۔ اس ہنگامے میں مارکیڈو کی لرزتی ہوئی آواز 'بچاؤ' سمندر کی طوفانی لہروں کے شور میں اس کی آواز دب جاتی ہے۔ جنگ کا ہنگامہ کئی لمحے جاری رہتا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ

آہستہ آہستہ تھم جاتا ہے۔

یُوسف: (آواز میں مسرت سے لرزش) مالک! مبارک ہو، سمندری لٹیرے شکست کھا کر چلے گئے ہیں۔ وہ دیکھیے سطح پر اُن کی نعشیں تیر رہی ہیں۔

مارکیڈو: او گاڈ! مائی گاڈ!!

یُوسف: اَب ہم بالکل محفوظ ہیں۔

مارکیڈو: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں؟

یُوسف: آپ کو اس مسئلے پر سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مَیں نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

مارکیڈو: مَیں تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں گا، یہ میرا مسئلہ ہے اور اپنی منزل پر پہنچ کر ہی اسے طے کروں گا۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔

یُوسف: کونسی بات؟ جناب!

مارکیڈو: مَیں نے تمہیں ایک خادم کے طور پر خریدا تھا، تم توانا اور قوی ضرور ہو، مگر یہ بحری جنگ جس انداز سے لڑی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ایسی لڑائیوں کا بڑا تجربہ ہے۔

یُوسف: آپ درست کہہ رہے ہیں جناب! میری آدھی زندگی سمندروں ہی میں گزری ہے۔

مارکیڈو: وہ کس طرح؟

یُوسف: مَیں سلطنتِ عثمانیہ کے شہنشاہ کی فوج میں شامل تھا۔

مارکیڈو: کس شہنشاہ کی فوج میں؟

یُوسف: سلیمانِ ذی شان کی فوج میں۔

مارکیڈو: تو عیسائیوں کی قید میں کس طرح آگئے؟

یُوسف: میرے شہنشاہ اور عیسائیوں کے درمیان بحری جنگ ہوئی اور مَیں بُری طرح زخمی ہو گیا، مجھے قیدی بنا لیا گیا اور ایک عیسائی نے مجھے آپ کے پاس

بیچ دیا۔ یہ ہے میری مختصر سی روداد۔

مارکیڈو: یوسف! آج سے تم خادم نہیں رہے۔

یوسف: میں اس مہربانی کے لیے آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مارکیڈو: ابھی شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ گوا پہنچ کر میں تمہارے ساتھ وہ سلوک کروں گا، جس کے تم واقعی مستحق ہو۔

(منظر بدلتا ہے۔ گوا میں مارکیڈو کے مکان کا ایک کمرہ، مارکیڈو اور یوسف اندر آتے ہیں)

مارکیڈو: ہم اپنی منزل پر صحیح سلامت پہنچ گئے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ میں تمہارے احسان کا بدلہ چکاؤں۔

یوسف: آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔

مارکیڈو: سنو یوسف! تمہاری بہادری، جرأت اور حسنِ اخلاق نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میرا اپنی حکومت پر بہت اثر ہے اور میں نے تمہارے لیے ایک ایسے بلند مرتبے کا انتظام کر دیا ہے کہ تم سنو گے، تو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آئے گا۔ میرے عزیز تم یہاں ایک شہر میں گورنر مقرر کیے جا رہے ہو۔

یوسف: یہ مرتبہ میری صلاحیتوں سے بہت بلند ہے، معذرت چاہتا ہوں۔

مارکیڈو: یوسف! تم میں اس مرتبے کی صلاحیتیں ہیں یا نہیں، اس کا فیصلہ مجھے کرنا ہے اور میں نے کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ تمہارا حصّہ میرے کاروبار میں بھی ہوگا۔ اور میری یہ بھی خواہش ہے کہ تمہارے ساتھ ایک ایسا رشتہ بھی قائم کر لوں جس پر تم ہمیشہ فخر کرو گے۔ یوسف! میری ایک بیٹی ہے۔ (دو تین لمحوں کے لیے خاموشی) تم کچھ بول نہیں رہے۔

یوسف: آپ نے مجھے بولنے کے قابل کہاں چھوڑا ہے؟

مارکیڈو: گورنری۔ تجارت میں شراکت اور دامادی۔ یہ سب کچھ تمہارے لیے ہے۔ صرف ایک کام کرنا ہوگا۔

یوسف: حکم کیجئے۔

مارکیڈو: میرے عزیز بیٹے! صرف عیسائیت قبول کرنا ہوگی۔

یوسف: (برافروختہ ہوکر) زبان کو لگام دیجئے جناب! یہ لفظ میں دوبارہ نہیں سُننا چاہتا۔

مارکیڈو: یوسف! تمہیں یک لخت کیا ہو گیا ہے؟

یوسف: آپ نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ اس کائنات میں جتنے ہیرے اور جواہرات ہیں اگر وہ سب کے سب میرے پاؤں پر ڈھیر کر دیے جائیں اور مجھ سے کہا جائے کہ صرف ایک لمحے کے لیے اپنا مذہب چھوڑ دو، تو میں یہ ساری دولت حقارت سے ٹھکرا دوں گا۔ اسلام مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میری زندگی اور موت اسلام ہی کے لیے وقف ہے۔

مارکیڈو: یوسف! تم پاگل پن کر رہے ہو۔

یوسف: یہ پاگل پن ہے تو میری زندگی کے آخری سانس تک برقرار رہے گا اور میں اپنی ایک نہیں، سو جانیں بھی اس پر قربان کر دوں گا۔

مارکیڈو: میں سمجھتا تھا یہ تمہارے لیے معمولی سی بات ہو گی۔

یوسف: اسلام کے ماننے والوں کے لیے مذہب کی تبدیلی قطعاً ناممکن ہے۔

مارکیڈو: تم نے مجھے ایک کشمکش میں ڈال دیا ہے۔

یوسف: کوئی کشمکش نہیں۔ میں اسی لمحے آپ سے رخصت ہو رہا ہوں۔

مارکیڈو: یوسف! ذرا رک جاؤ۔

یوسف: آپ پھر ایسی بات کہیں گے جس سے مجھے دُکھ ہو گا۔

مارکیڈو: میں اب ایسی کوئی بات نہ کہوں گا۔ مجھے پوری طرح احساس ہو گیا ہے کہ اپنے مذہب کے بارے میں تمہارے خیالات کیا ہیں۔ اب بتاؤ تم یہاں رہنا چاہتے ہو یا جانا چاہتے ہو؟

یوسف: جانا چاہتا ہوں۔

مارکیڈو : یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟

یوسف : جی ہاں۔

مارکیڈو : مَیں یہ نہیں چاہتا کہ اپنے محسن کو اس طرح رخصت کر دں۔ بولو کم سے کم کیا چاہتے ہو؟

یوسف : کچھ بھی نہیں۔

مارکیڈو : یوسف! مجھے یہ احساس نہ ہونے دو کہ مَیں کسی کے احسان کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا، بتاؤ کیا چاہتے ہو؟

یوسف : مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔

مارکیڈو : اچھا، تو تم یہ رقم لے لو۔

یوسف : جناب!

مارکیڈو : آخر تم نے میری خدمت کی ہے، یہ اس کا بہت معمولی صلہ ہے، اس سے کیا خرید دگے؟

یوسف : مَیں ایک سپاہی ہوں اور وہی چیزیں خریدوں گا جن کی ایک سپاہی کو ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے ایک عربی النسل گھوڑا چاہیے اور ایک تلوار، ایک بندوق اور ایک ڈھال۔ ان کے لیے مجھے جتنا روپیہ چاہیے لے لوں گا، اس سے زیادہ نہیں۔

مارکیڈو : تو جاؤ، آسمانی باپ تم پر رحم کرے۔

یوسف : الوداع! خدائے بزرگ و برتر آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

(یوسف جانے لگتا ہے)

مارکیڈو : (ذرا بلند آواز سے) یوسف!

یوسف : فرمایئے۔

مارکیڈو : تم نے یہ نہیں بتایا، اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟

یوسف : ارادہ یہ ہے کہ ہندوستان کی کسی مسلم ریاست میں قسمت آزمائی

کردوں۔

مارکیٹرڈ: کس ریاست میں؟

یوسف: جنوبی ہندوستان میں کئی مسلم ریاستیں ہیں۔ مثلاً بیجاپور۔

مارکیٹرڈ: کیا تم چند روز بھی نہیں رُک سکتے؟

یوسف: نہیں۔ میں ایک دن بھی نہیں رُک سکتا۔

(منظر بدلتا ہے:

ریاست وِزیانگر کا ایک جنگل۔ ریاست کے راجہ کے دو ملازم ایک لڑکی عائشہ کو زبردستی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یوسف آتا ہے)

یوسف: (آواز میں گرج) کون ہو تم؟ اور لڑکی سے یہ سلوک کیوں کر رہے ہو؟

ایک ملازم: جناب! یہ راج بھون میں نوکرانی ہے۔ وہاں سے بھاگ آئی ہے۔

عائشہ: (روتے ہوئے) غلط کہتا ہے۔ یہ ظالم مجھے میرے باپ کے گھر سے زبردستی لے آئے ہیں۔

دوسرا ملازم: نہیں جناب! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وِزیانگر کے راجہ کے راج بھون سے بھاگ کر آئی ہے۔ ہم نے راجہ کے حکم سے اس کا پیچھا کر کے گرفتار کر لیا ہے۔

یوسف: اسے بھاگ کر اس سنسان جنگل میں آنا تھا، کہیں اور نہ جا سکتی تھی؟

پہلا ملازم: یہ جناب! جنگل کے پار رہتی ہے۔

یوسف: خاتون! تمہارا نام کیا ہے؟

عائشہ: عائشہ۔

یوسف: تم راجہ کے محل سے نکل کر آئی ہو؟

عائشہ: میں نے آج تک راجہ کا محل ہی نہیں دیکھا، وہاں سے بھاگ کیسے سکتی تھی؟

یوسف: تو یہ لوگ تمہیں پکڑ کر لے جانا چاہتے ہیں؟

عائشہ: میں اُدھر رہتی ہوں، اپنے بوڑھے باپ کے پاس۔ ایک دن راجہ شکار کھیلنے آیا تو اس نے مجھے دیکھ لیا اور مجھ سے کہا چلو میرے ساتھ۔ راج بھون میں، ہم تمہیں زر و جواہر سے لاد دیں گے۔

یوسف: ٹھیک!

عائشہ: میں نے انکار کر دیا اور آج راجہ نے ان لوگوں کو بھیجا ہے اور یہ مجھے زبردستی میرے باپ سے چھین کر لے آئے ہیں۔ میرے ضعیف باپ کو بُری طرح زخمی کر دیا ہے۔

دوسرا ملازم: چلو یہی سہی۔ مسافر! تم اپنی راہ لو۔ ہمیں کچھ کہنے سُننے کی ضرورت نہیں۔ چلو لڑکی۔

(عائشہ زور زور سے رونے لگتی ہے)

یوسف: (گرج کر) ٹھہرو!

پہلا ملازم: مسافر! (میان سے تلوار نکال کر) رعب کسی اور پر جمانا، کچھ گڑبڑ کی تو ابھی تمہارا سارا شریر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

یوسف: تم کو معلوم نہیں، اس وقت کس سے مخاطب ہو۔ میں سلیمان ذی شان کا بہادر سپاہی ہوں۔

پہلا ملازم: (حقارت سے قہقہہ لگا کر) سلمان ذی شان، ہم کیا سمجھتے ہیں اُسے؟

یوسف: تو پھر آؤ، دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

دوسرا ملازم: بیوقوف نوجوان! دیکھ نہیں رہے ہم دو ہیں۔

یوسف: میرے سامنے راجہ کے دو ملازم کیا حقیقت رکھتے ہیں؟

پہلا ملازم : مرنا ہی چاہتے ہو، تو آجاؤ۔

(تلواروں کا ٹکراؤ، یوسف شدید طور پر زخمی ہو کر کراہتا ہے، عائشہ کے ہونٹوں سے چیخ نکل جاتی ہے۔)

دوسرا ملازم : بڑا آیا تھا شور رہا، اب دم توڑ رہا ہے۔

عائشہ : ہائے ظالمو، یہ تم نے کیا کیا؟

پہلا ملازم : اب بلاؤ کسی اور محافظ کو، بلاؤ۔

(زوردار قہقہہ)

عائشہ : چھوڑ دو مجھے، میں نہیں جاؤں گی۔

پہلا ملازم : لڑکی! دیکھ نہیں رہی، ابھی ہماری تلواریں میانوں میں واپس نہیں گئیں۔ اگر انکار کیا، تو تیرا بھی یہی حال ہوگا۔

عائشہ : مجھے مار ڈالو، مگر میں نہیں جاؤں گی۔

دوسرا ملازم : موہن! اسے زبردستی اٹھالو، راجہ ہماری راہ دیکھ رہا ہے۔

عائشہ : بدبختو! مجھے چھوڑ دو، ہائے میرے اللہ! ظالمو! بخاکو!

(زور زور کی چیخیں)

پہلا ملازم : بُری طرح چیخ رہی ہے۔ گھونٹ دو اس کی گردن۔

(منظر بدلتا ہے:

(دریا نگر کے راجہ کا محل۔ ملازم عائشہ کو لے کر آتے ہیں۔ راجہ ایک طرف سے آتا ہے۔)

پہلا ملازم : مہاراج! ہم وہ لڑکی لے آئے ہیں۔

راجہ : لے آئے ہو، ہمیں تم پر یہی وشواس تھا۔

دوسرا ملازم : مہاراج! پہلے تو اس کے باپ نے ہمارا ہاتھ پکڑا، مگر ہم نے ایک ہی وار سے اُسے بُری طرح گھائل کر دیا۔

راجہ : ٹھیک کیا تم نے۔

پہلا ملازم : مہاراج ! پھر جب جنگل میں سے گذر رہے تھے، تو تُرک بادشاہ سلمان کا کوئی سپاہی ہمارے سامنے آگیا۔

راجہ : تُرک سپاہی ؟

دوسرا ملازم : جی ہاں، مہاراج ! ہم نے کہا، چھوڑ دو لڑکی کو۔ بھلا ہم اس کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈر کیسے سکتے تھے، اس نے تلوار نکال لی، ادھر ہم نے بھی تلواریں سونت لیں، لڑائی ہوئی اور ہم نے اُسے مار ڈالا۔

راجہ : یہ بھی ٹھیک کیا۔ لڑکی کو لاؤ ہمارے سامنے۔

(راجہ کی ایک پُرانی ملازمہ ستوتی عائشہ کا ہاتھ پکڑے لاتی ہے۔)

ارے یہ بولتی کیوں نہیں ؟

پہلا ملازم : مہاراج ! بُری طرح چیخ رہی تھی۔ ہم نے سوچا اس کی چیخیں سُن کر لوگ نہ آجائیں۔

راجہ : تم نے کیا کیا ؟

دوسرا ملازم : ذرا مہاراج ! آہستہ سے اس کا گلا ....

راجہ : گلا گھونٹ دیا ؟

پہلا ملازم : دھیرے سے مہاراج ! دھیرے سے۔

راجہ : تم کتنے ڈرپوک اور پاگل ہو۔ لوگوں کے ڈر سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اگر یہ زندہ نہ رہی، تو ہم تم دونوں کو پھانسی پہ لٹکا دیں گے۔

دونوں ملازم : (ایک ساتھ خوف زدہ) شما کیجئے مہاراج شما ! ہم نے کچھ نہیں کیا۔ شما مہاراج !

راجہ : فوراً ہمارے خاص وید کو بلاؤ۔ جاؤ۔

دونوں ملازم : جاتے ہیں مہاراج !

(منظر بدلتا ہے :

اعظم رُشدی کا گھر۔ یُوسف جو زخمی حالت میں ہے۔ ایک

چارپائی پر پڑا ہے، پاس اعظم رُشدی کھڑا ہے۔)

اعظم : یُوسف بیٹا!

یوسف : جی، چچا جان!

اعظم : بیٹا! میں دیکھ رہا ہوں، تُو کبھی کبھی نہ جانے کس سوچ میں ڈوب جاتا ہے کہ تجھے کوئی اور خیال ہی نہیں رہتا، کیا معاملہ ہے یُوسف؟

یوسف : کیا عرض کروں جناب!

اعظم : جو بات ہے مجھے بتاؤ۔

یوسف : مَیں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ جب گوا سے نکل کر ایک جنگل میں سے گزر رہا تھا تو وہاں ایک لڑکی دیکھی تھی جسے راجہ کے ظالم سپاہی محل میں لیے جا رہے تھے۔ مَیں اس لڑکی کی مدد نہ کر سکا۔

اعظم : تم نے اس کے لیے جان کی بازی تو لگا دی تھی۔

یُوسف : لیکن مَیں اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ کاش! مَیں بے ہوش نہ ہو جاتا۔ اس کا خیال آتا ہے تو بڑا دُکھ ہوتا ہے۔

اعظم : یُوسف خاں!

یُوسف : ارشاد!

اعظم : تم نے ہوش میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ مجھ سے گفتگو کی تھی کہ تم صرف اسلام کے لیے زندہ رہنا اور اسی کے لیے مرنا چاہتے ہو، کیا یہ بات نہیں کہی تھی؟

یُوسف : کہی تھی چچا جان!

اعظم : تو اپنا مقصد بھول نہیں بیٹا!

یُوسف : مگر وہ لڑکی۔ اس وقت کس حال میں ہو گی۔ ظالم اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔ یہ چیز میرے لیے سوہان رُوح بنتی جا رہی ہے۔

(اعظم رُشدی خاموش رہتا ہے)

اوہ! آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے؟ چچا جان!

اعظم : نہیں تو بیٹا! تیرا مقصد بڑا بلند ہے، خدا تجھے اس مقصد پر عمل کرنے کی توفیق دے! اس کے سامنے دوسری چیزیں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ سنا بیٹے؟

یوسف : جی ہاں، سُن رہا ہوں۔ ذرا سی خاموشی، چچا جان!

اعظم : کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟

یوسف : میں ساری زندگی آپ کا احسان مند رہوں گا کہ آپ مجھے سخت زخمی حالت میں جنگل سے اٹھا کر لائے۔ میری مرہم پٹی کی اور یہ آپ ہی کی تیمارداری کا نتیجہ ہے کہ میں آج دوبارہ سانس لے رہا ہوں۔

اعظم : یہ اتفاق تھا کہ میں ادھر سے گزرا، تم پر نظر پڑ گئی اور تمہیں لے آیا۔

یوسف : کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں! بالکل اجنبی ہونے کے باوجود آپ نے میرے لیے وہ کچھ کیا جو ایک سگا باپ ہی کر سکتا ہے۔ میں جانے سے پہلے اپنے محسن کا نام پوچھنا چاہتا ہوں۔

اعظم : میرا نام اعظم رُشدی ہے، چھوٹی موٹی تجارت کر کے گزارہ کرتا ہوں۔

یوسف : آپ اکیلے رہتے ہیں؟ (اعظم کوئی جواب نہیں دیتا) آپ خاموش کیوں ہو گئے؟

اعظم : بیٹا! اکیلا تھا تو نہیں، مگر اکیلا ہو گیا۔ اب زندگی میں کوئی سہارا نہ رہا۔ خیر چھوڑو اس قصّے کو۔ تم بتاؤ آئندہ ارادہ کیا ہے؟

یوسف : میں نے سلیمان ذی شان کی فوج سے الگ ہونے کے بعد سوچ لیا تھا کہ ہندوستان کی کسی ریاست میں جا کر کوئی خدمت کروں گا۔ اب بھی یہی ارادہ ہے۔

اعظم : تمہیں خبر ہے بیجاپور ایک اسلامی ریاست ہے۔

یوسف : وہیں جاؤں گا۔

اعظم : مگر مشکل یہ ہے کہ اس وقت بیجاپور اور ہندو ریاست وجیا نگر کے درمیان تعلقات بہت کشیدہ ہیں، کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی ہے۔ مجھے ڈر ہے بیجاپور کا حاکم ان تمہارا خیر مقدم نہیں کرے گا۔

یوسف : وہ کیوں ؟

اعظم : تمہیں دشمن کا جاسوس بھی تو سمجھا جا سکتا ہے۔

یوسف : میں اور دشمن کی جاسوسی ؟

اعظم : میں نے کہا نا، آج کل فضا زہر آلود ہے، ہر شخص پر شک و شبہ ہو سکتا ہے۔

یوسف : یہ تو میری بدقسمتی ہو گی۔

اعظم : (خوشی سے) یوسف! قدرت تمہارے لیے ایک بہت اچھا موقع پیدا کر رہی ہے۔

یوسف : وہ کیا، چچا جان!

اعظم : بیجاپور کے حکمران سلطان علی عادل شاہ کی شادی احمد نگر کے تاجدار حسین نظام کی بیٹی چاند بی بی سے ہو رہی ہے۔ اس موقع پر بڑی بڑی تقریبیں ہوں گی۔ سینکڑوں ہنرمند اپنے اپنے ہنر دکھائیں گے، شہ زوری کے کرتب بھی ہوں گے۔ تم ماشاء اللہ تنومند اور قوی ہو۔ اگر شہ زوری کے مقابلے میں اپنا حریف پچھاڑ دو گے، تو ہو سکتا ہے سلطان کی نظر تم پر پڑ جائے۔

یوسف : میں بڑے سے بڑے پہلوان کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔

اعظم : تو پھر صبر و تحمل کے ساتھ صحت یاب ہونے کا انتظار کرو، چند روز ہی کی تو بات ہے، بالکل تندرست ہو جاؤ گے۔

(منظر بدلتا ہے۔ ریاست بیجاپور کا ایک میدان۔ موسیقی بگل کی آواز میں مدغم ہو جاتی ہے۔ بگل کی آواز مدھم پڑتے ہی زور زور سے ڈھول بجنے لگتا ہے۔ ڈھول کا شور آہستہ آہستہ مدھم ہوتا ہے۔ سدی حسن کی گرج دار آواز بلند ہوتی ہے۔)

سدی حسن : کوئی ہے ماں کا لال جو میرے مقابلے پر آئے؟ کوئی ہے؟ کوئی ہے؟

یُوسف : مَیں ہوں۔

سِدّی حسن : تم۔ (پُر زور حقارت آمیز قہقہہ) کون ہو تم؟

یُوسف : یُوسف خاں۔

سِدّی حسن : تمہیں اپنی جان عزیز نہیں؟

یُوسف : یہ تو میدان میں اُتر کر ہی معلوم ہوگا کہ کس کو اپنی جان عزیز نہیں۔

سِدّی حسن : مَیں تمہارا مقابلہ کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں، خیر نہیں تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ میرے مقابلے پر وہ نوجوان آتے جو مشہور پہلوان اور نامور شہ زور ہو۔

یُوسف : مجھ میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ آؤ میدان میں۔

سِدّی حسن : اچھا، یہ دَم خم ہیں، مرنا چاہتے ہو تو مَیں تمہیں نہیں روک سکتا۔ کیا کفن دفن کا انتظام کر دیا ہے؟

یُوسف : مَیں ایک اجنبی ہوں، مر جاؤں گا تو لوگ رحم کھا کر دفن کر دیں گے۔

سِدّی حسن : (حقارت انگیز قہقہہ) اجنبی ہو اور مرنے کے لیے بیجاپور آئے ہو! خوب، آؤ!

(بگل کی آواز، ڈھول کا شور، تلواروں کا ٹکراؤ، جو کئی لمحے جاری رہتا ہے — ایک دم سناٹا چھا جاتا ہے۔ سِدّی حسن کی کراہ۔ وقفہ — جس میں موسیقی کی ہلکی ہلکی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں۔)

یُوسف : اللہ اکبر!

سلطان : شاباش، نوجوان!

یُوسف : یہ ناچیز سلطانِ ذی جاہ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے۔

سُلطان : کون ہو تم؟ ہم نے اس سے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔

یُوسف : یہاں کسی نے بھی مجھے نہیں دیکھا۔ مَیں ترکی النسل سپاہی ہوں۔ ترکی میرا وطن ہے۔

سلطان : آج تم نے کمال کر دیا۔ بندی حسن جنوبی ہندوستان کا سب سے طاقتور پہلوان سمجھا جاتا تھا۔ تم نے اسے شکست دے کر بُری طرح زخمی کر دیا ہے۔

یوسف : جناب! اس نے مجھے حقارت سے للکارا تھا۔ یہ اس کا نتیجہ ہے۔

سلطان : تمہارا نام؟

یوسف : یوسف خاں۔

سلطان : یوسف! ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اگر تم ہمارے ملک سے وابستہ ہونے کے خواہش مند ہو تو ہم تمہیں اپنا محافظ اعلیٰ بنا دیں گے۔

یوسف : اگر حضور مجھے اپنی خدمت کا موقع دیں، تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

سلطان : تم اس ملک میں بالکل اجنبی ہو، ہم تم سے ایک خاص کام لینا چاہتے ہیں۔

یوسف : بندہ حاضر ہے۔

سلطان : آج سے تم ہمارے محافظِ اعلیٰ ہو۔ عثمان اسے لے جاؤ اور وردی پہنا دو۔

(منظر : وزیا نگر کے راجہ، رام راجہ کا محل۔ محل کی ایک پرانی بوڑھی ستوتی عائشہ سے مخاطب ہے)

ستوتی : اے میں نے کہا عیشاں! پگلی تجھے مہاراج نے بلایا ہے اور تو یہاں بھیکڑا مار کر بیٹھی ہے۔

عائشہ : تو میں کیا کروں؟

ستوتی : لو دیکھو۔ کہتی ہے میں کیا کروں۔ اری نگوڑی! تیرے تو بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔

عائشہ : یہ میرے بھاگ جاگے ہیں بڑھیا چڑیل!

ستوتی : عیشاں! سچ کہتی ہوں۔ میرا سارا جیون مہاراج وجیا نگر کے راج بھون

میں گزرا ہے۔ بڑی بڑی مہارانیاں دیکھی ہیں۔ پر مہاراج جو تیرا کھیال کرتے ہیں اور کسی کا ناہیں کرتے، اُٹھ عیشاں رانی اُٹھ!

عائشہ: مَیں نہیں جاتی کسی کے پاس!

سُتوتی: اری کچھ سُنا بھی ہے، ایک دُور دیس کا رہنے والا جوہری آیا ہے، انول، ہیرے موتی لایا ہے۔ مہاراج کہتے ہیں عیشاں دیکھ کر پسند کرے گی۔

عائشہ: مجھے ہیروں کا کوئی شوق نہیں۔

سُتوتی: کیسی عورت ہے تُو! جگ میں کوئی ایسی عورت بھی ہوگی جسے ہیروں سے پیار نہ ہو۔ اری بٹیا کیوں ہے! تیرے من کا کیا حال ہے، مَیں جانتی ہوں۔

عائشہ: مَیں نے کہہ دیا ہے نہیں جاؤں گی، بالکل نہیں جاؤں گی۔

سُتوتی: بس اب جیادہ نخرے نہ دکھا، بوڑھی نوکرانی کو کیا نخرے دکھاتی ہے؟ واری جاؤں اُٹھ بیٹھ! چل جرا ٹھیک ٹھاک کر اپنے پیا کے پاس!

عائشہ: تو دفع ہوتی ہے یا نہیں، بوڑھی مردار!

سُتوتی: ہائے بھگوان! یہ کل کی چھوکری مجھے بوڑھی مردار کہہ رہی ہے۔ گجب ہو گیا۔

عائشہ: بوڑھی ڈائن! مَیں کہتی ہوں مجھے رانی وانی مت کہو۔

(راجہ کی کسی قدر زور سے آواز آتی ہے)

راجہ: اے سُتوتی۔

سُتوتی: ہائے! مہاراج خود آ رہے ہیں۔ بھگوان کی مار ہو تجھ پر، اب تو اُٹھ بیٹھ۔

(راجہ آتا ہے۔)

راجہ: سُتوتی! عائشہ کو لے کر کیوں نہیں آئی؟

سُتوتی: مہاراج! مَیں تو کہہ رہی ہوں اس سے، مانتی ہی نہیں پوچھ

لیجئے مہاراج!

راجہ: اُٹھو عائشہ۔

عائشہ: مجھے جواہرات کا شوق نہیں، ایک بار کہہ جو دیا۔

راجہ: اچھا، تو تم نہیں چاہتیں۔ تو جوہری کو ادھر ! لیتے ہیں۔ ستو تی اسے بُلا لاؤ۔

(یوسف جوہری کے بھیس میں آتا ہے اور عائشہ کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے۔)

راجہ: تم ٹھٹک کیوں گئے جوہری؟

یوسف: جی، کوئی بات نہیں۔

راجہ: تم نے عائشہ کو پہلے کبھی دیکھا ہے؟

یوسف: راجہ صاحب! میں نجمی آفندی، ہیروں اور جواہرات کا جوہری' ملک ملک گھومنے والا انہیں کہاں دیکھ سکتا تھا؟ ان کی شکل میری ایک عزیزہ سے ملتی ہے۔

راجہ: اس کی شکل تمہاری ایک عزیزہ سے ملتی ہے۔ ٹھیک ہے' عائشہ جوہری کا مال دیکھو۔

عائشہ: مجھے ان چیزوں کا کوئی شوق نہیں۔

یوسف: آپ دیکھیے تو سہی، بہت اعلیٰ چیزیں لایا ہوں۔

عائشہ: میں نہیں لوں گی۔

یوسف: مہاراج! آج نہ سہی، کل پرسوں سہی۔ میں چند روز آپ ہی کے شہر میں ہوں۔

راجہ: ہاں کل آنا۔

(منظر بدلتا ہے۔ محل کے ایک کمرے میں عائشہ اور یوسف گفتگو کر رہے ہیں۔)

عائشہ: (لہجے میں سخت حیرت) آپ!

یُوسف: جی، مَیں یوسف۔

عائشہ: سچ مچ وہی ہیں جنھوں نے جنگل میں میری خاطر سپاہیوں سے جنگ کی تھی؟

یوسف: بالکل وہی ہوں۔

عائشہ: مجھے ان آنکھوں پہ اعتبار نہیں آتا، آپ تو مر گئے تھے۔

یوسف: مر گیا تھا، پھر زندہ ہو گیا۔

عائشہ: پھر زندہ ہو گئے؟

یوسف: عائشہ! اصل میں قصّہ یہ ہوا کہ خدا نے عین موقع پر میری مدد کی۔ ایک شخص وہاں آ گیا۔ ابھی مجھ میں کچھ جان باقی تھی۔ وہ مجھے گھر لے گیا، علاج کرایا اور میں ٹھیک ہو گیا۔

عائشہ: حیرت ہے!

یوسف: حیرت ہے ہمیں ایک مرتبہ پھر ملنے کا موقع مل گیا۔

عائشہ: کل جب آپ کو دیکھا تو دل بہت بیتاب تھا۔ یہاں ہر وقت میرے گرد پہرہ رہتا ہے۔ وہ بڑھیا ستو تی تو مجھے ایک لمحہ بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ میری حالت بہت خراب ہے۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالیے۔

یوسف: عائشہ!

عائشہ: جی!

یوسف: مَیں تمہاری حالت سے بے خبر نہیں، مگر مَیں تو ایک مقصد لے کر یہاں آیا ہوں، اسے پورا کیے بغیر یہاں سے جا نہیں سکتا۔

عائشہ: وہ مقصد کیا ہے؟

یوسف: شاید تم اس مقصد میں میری مدد کر سکتی ہو۔

عائشہ: وہ مقصد تو بتایئے۔

یوسف : اس وقت راجہ وزیانگر اور بیجاپور کے سلطان میں بڑی دشمنی ہے۔ وزیانگر کا راجہ اسلامی ریاست تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے اور اس کے لیے اندرونِ خانہ تیاریاں کر رہا ہے۔ میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ یہاں حالات کیا ہیں۔

عائشہ : آپ جوہری نہیں؟

یوسف : جوہری کے رُوپ میں آیا ہوں۔

عائشہ : میں تو یہاں ایک قیدی ہوں۔

یوسف : عائشہ، تم یہی چاہو گی کہ تمہیں یہاں سے نکالنے کا بندوبست کروں۔ یہ تمہارا حق ہے، لیکن عائشہ!

عائشہ : میں جانتی ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

یوسف : قدرت مجھ سے ایک خدمت لینا چاہتی ہے۔

عائشہ : اور مجھ سے بھی۔

یوسف : تم اس مقصد میں میری مدد کرو گی؟

عائشہ : یقیناً، ہر طرح۔

یوسف : تم کچھ بتا سکتی ہو؟

عائشہ : دو تین روز سے محل میں ایک شخص آ رہا ہے۔ راجہ اسے دیکھتے ہی ہم سب کو فوراً چلے جانے کا حکم دے دیتا ہے اور تنہائی میں اس سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ مجھے یہ شخص مسلمان معلوم ہوتا ہے۔

یوسف : مسلمان!

عائشہ : ہاں۔

یوسف : کچھ بتاؤ یہ کون ہے؟

(ستوتی کی آواز آتی ہے۔)

ستوتی : عیشاں!

عائشہ : آگئی چڑیل، جاؤ۔

(ستوتی آکر دونوں کو دیکھ لیتی ہے)

ستوتی : ارے! تم اور یہ جوہری؟ (زور سے) مہاراج! مہاراج! (سانس پھولی ہوئی) مہاراج!

(یوسف تیزی سے چلا جاتا ہے۔ راجہ آتا ہے۔)

راجہ : کیا ہے؟

ستوتی : (سانس پھولی ہوئی) مہاراج! وہ جوہری ہے... چھپ کر باتیں....

راجہ : (زور سے) فوراً پکڑ لو جوہری کو، جاسوس ہوگا۔

(بگل کی آواز، بہت سے لوگوں کے بھاگنے کا شور۔ تلواروں کا ٹکراؤ، چند لمحوں کے بعد موسیقی اور شور یک لخت طور پر فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے۔ کامل سناٹا جس میں جیل کے دروازے کھلنے کی آواز آتی ہے۔)

سِدّی حسن : (لہجے میں شدید حقارت) یوسف۔

یوسف : کون؟ سدّی حسن۔

سدّی حسن : پہچانتے ہو مجھے؟

یوسف : تم یہاں؟

سدّی حسن : ہاں، میں اس جیل خانے میں آیا ہوں، جانتے ہو کیوں؟

یوسف : مجھے کیا خبر؟

سدّی حسن : میں اپنی توہین کا انتقام لینے آیا ہوں۔ مجھے زندگی میں کبھی شکست نہیں ہوئی تھی۔ تم نے مجھے شکست دی اور آج جیل خانے کی اس تنہائی میں میری تلوار تمہارے ساتھ وہی سلوک کرے گی، جو تمہاری تلوار نے میرے ساتھ کیا تھا۔

یُوسف : مگر سدّی حسن! تم تو سلطان علی عادل شاہ کے سپاہی ہو۔ ایک مسلم ریاست کے محافظ، وجیانگر میں تمہارا کیا کام؟

سدّی حسن : میرا کام ہے انتقام لینا، تم سے اور سلطان سے۔ تم نے مجھے ذلیل

کیا اور سلطان نے مجھے میرے عہدے سے ہٹا کر تمہیں مقرر کر دیا۔

یوسف : سیدی حسن! تم مجھ سے کہتے ہیں یہ عہدہ ہرگز قبول نہ کرتا۔ اپنے وطن سے غداری کیوں کر رہے ہو؟ سیدی حسن!

سیدی حسن : سلطان نے مجھے عزت سے محروم کر دیا اور یہاں مجھے اس عزت سے لاکھ درجے زیادہ مرتبہ ملے گا۔

یوسف : لیکن اس کے بدلے تم کیا دے رہے ہو؟ سیدی حسن۔

سیدی حسن : میں کیا دے رہا ہوں؟

یوسف : اپنی زندگی کی ساری عظمت، اپنی روح کا سارا جلال و جمال، اپنا وہ سب کچھ جو ایک مسلمان کا سب سے بڑا اثاثہ ہوتا ہے۔ صرف ذاتی انتقام کی خاطر۔ اگر تمہارے انتقام کی پیاس میرے خون سے بجھ سکتی ہے۔ تو نکالو اپنا خنجر میان سے اور میرے سینے میں بھونک دو، مگر خدا کے لیے اپنے وطن سے غداری نہ کرو۔ سُن رہے ہو؟ سیدی حسن!

سیدی حسن : کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو، تو کہہ لو، کیونکہ اس کے بعد تمہاری زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔

یوسف : سیدی حسن! اپنے اس مکروہ فعل سے اپنے وطن کے ساتھ دشمنی مت کرو۔

سیدی حسن : میں اُنہی کے ساتھ دشمنی کر رہا ہوں، جنہوں نے میرے ساتھ دشمنی کی ہے۔

یوسف : لیکن بیجاپور کے بوڑھوں، بچوں، جوانوں اور عورتوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تم ان سے ان کی زندگی کی خوشیاں کیوں چھین لینا چاہتے ہو؟ تم آزاد ہاتھوں میں غلامی کی زنجیریں کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟ تم روشنیوں کے آگے تاریکی کی دیواریں کیوں کھڑی کر رہے ہو؟ جاؤ واپس چلے جاؤ۔

سیدی حسن : میں واپس چلا جاؤں؟

یوسف: ہاں سیدی حسن! تمہارا ضمیر بیدار ہو گیا ہوگا، تمہاری آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔

سیدی حسن: (حقارت انگیز قہقہہ لگاکر) یوسف! میرا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا، جہاں اس وقت تم ہو، کل یہاں تمہارا حکمران علی عادل شاہ بھی ہوگا۔

یوسف: سیدی حسن!

سیدی حسن: میرے دونوں مجرم یہاں ایک ساتھ دم توڑیں گے۔ میری تلوار کل تک میان ہی میں رہے گی۔

یوسف: سیدی! کمینے! غدار!

سیدی حسن: (قہقہہ لگاکر) نہتے ہو کر بھی حملہ کرنا چاہتے ہو۔ تھوڑا سا مزا چکھ لو۔

(یوسف کی ہائے کی آواز)

(اب تم اپنے لہو میں لت پت اطمینان سے لیٹے رہو گے۔

(بگل کی آواز)

سُن رہے ہو یہ آواز۔ یہ علی عادل شاہ کی موت کا پیغام ہے۔ (دنیا نگر کی فوجیں اس کا ملک پامال کرنے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔

(بگل کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے اور پھر سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں میں مدغم ہو جاتی ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں چند لمحے جاری رہتی ہیں۔ ان کے مدھم پڑنے پر بیجاپور کے شاہی محل کے خادم کی آواز اُبھرتی ہے۔)

خادم: کون ہے تو۔ شاہی محل میں کیوں گھسی چلی آرہی ہے؟

عائشہ: (سانس پھولی ہوئی) مجھے سلطان سے ملنا ہے ــــ بہت ضروری بات ہے۔

خادم: کیا کام ہے تجھے؟ یوں نہیں مل سکتی تو۔

عائشہ: خدا کے لیے مجھے مت روکو، ایک ضروری اطلاع دینی ہے۔

مت روکو، جانے دو مجھے، جانے دو۔

خادم : نہیں جا سکتی۔

عائشہ : اوہ میرے اللہ! (بلند آواز سے) سلطان!

سلطان : (دُور سے)، عثمان کون ہے؟

خادم : کوئی عورت ہے حضور!

(ذرا سا وقفہ)

عائشہ : سلطان! وزیا نگر کی فوجیں حملہ کر رہی ہیں، آپ پر اچانک۔

سلطان : کیا کہا؟

عائشہ : غدّار سدّی حسن نے راجہ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ یوسف قید میں ہے اور راجہ کی فوجیں بڑی تیزی سے آ رہی ہیں۔ حضور! جلدی کریں۔

سلطان : تم کون ہو؟

عائشہ : میں راجہ کے محل سے آئی ہوں۔ میرا نام عائشہ ہے۔ حضور جلدی، جلدی۔ اوہ۔ حضور!

سلطان : عائشہ!

خادم : بے ہوش ہو گئی ہے حضور!

سلطان : عثمان! اسے سنبھالو۔ (بلند آواز سے) معظم! سپہ سالار کو بلاؤ۔

(اس کے فوراً بعد بگل کی آواز گونجتی ہے، گھوڑوں کی ہنہناہٹ۔
بگل کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہو جاتی ہے۔ اس آواز کے مدھم ہونے
پر راجہ کے سپاہیوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں بلند ہوتی ہیں)

(منظر بدلتا ہے)

راجہ : سدّی حسن! یہ کیا معاملہ ہے؟

سدّی حسن : کیا ہے؟ جناب!

راجہ : تم دیکھ نہیں رہے ہو؟ وہ چاروں طرف گرد و غبار، اس کے پیچھے

فوج آرہی ہے۔

سیدی حسن : سلطان کے سپاہی معلوم ہوتے ہیں۔

راجہ : سلطان کو کس نے اطلاع دی ؟ ہمارا منصوبہ ناکام رہا۔

سیدی حسن : اس کا خیال نہ کیجئے، سلطان کی فوج ہماری فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پروا نہ کیجیے جناب! سلطان کو شکست ہوگی۔

(جنگ کا ہنگامہ، توپوں کی گولہ باری، گولیوں کی بوچھاڑ، یہ ہنگامہ برابر بڑھتا جاتا ہے اور پورے عروج پر پہنچ کر مدھم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ خاموشی میں اذان کی آواز دُور سے بلند ہوتی ہے۔)

سلطان : (دُعائیہ انداز میں) اے خدائے لایزال، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تُو نے مجھ حقیر بندے کو نوازا، دشمن پر فتح دی پروردگار! اپنی رحمت کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر پھیلائے رکھ!

(ذرا سا وقفہ جس میں اذان کے آخری الفاظ سنائی دیتے ہیں)

خادم (حضور! راجہ کی نعش کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔

سلطان : اور سیدی حسن کا کیا بنا؟

خادم : سپاہی اسے زنجیروں میں جکڑ کر لا رہے ہیں۔

(سیدی حسن زنجیروں میں جکڑا ہوا سلطان کے سامنے لایا جاتا ہے۔)

سلطان : سیدی حسن! غدار! ننگِ ملت! اب آنکھیں کیوں جھکالی ہیں، بولتے کیوں نہیں ؟

سیدی حسن : میں کیا بولوں ؟

سلطان : بے حیا! تجھے خبر ہے تُو نے دنیا کا سب سے بڑا جرم کیا ہے اور دُنیا کی کوئی بھی سزا تیرے لیے کافی نہیں، جاؤ اسے لے جاؤ، اس کا لہو بھی ہماری مقدس سرزمین پر نہیں بہنا چاہیے۔

سیدی حسن : حضور سلطان! رحم کریں! مجھ پر رحم کریں!

سلطان: جاؤ لے جاؤ، ہٹا دو اسے ہماری آنکھوں کے سامنے سے۔

(یوسف اور عائشہ آتے ہیں)

سلطان: یوسف! مبارک ہو کہ تم زندہ و سلامت واپس آ گئے ہو۔

یوسف: حضور! یہ آپ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہمارے سپاہی چند لمحے دیر سے پہنچتے، تو وہ لوگ مجھے مار ڈالتے۔

سلطان: اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرو، اور عائشہ بیٹی!

عائشہ: جی حضور!

سلطان: ہم تمہارے بہت ممنون ہیں۔ تم نے بڑے نازک وقت میں ہماری مدد کی ہے۔

عائشہ: مَیں نے اپنا فرض انجام دیا ہے حضور!

سلطان: ہم تم سے بہت خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ زندگی کے سفر میں تم یوسف کا ساتھ دو۔

(عائشہ خاموش رہتی ہے)

یوسف! تم کو یہ ہماری تجویز پسند ہے؟

یوسف: مَیں سلطان کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سلطان: عائشہ! کیا ہم تمہاری خاموشی کو تمہاری رضا پر محمول کریں؟

عائشہ: حضور! مَیں شکر گزار ہوں، مگر ابھی مجھے ایک فریضہ ادا کرنا ہے اس کی اجازت دیجیے۔

سلطان: اجازت ہے۔

(منظر بدلتا ہے۔ اعظم رُشدی کا مکان۔ یوسف اور عائشہ آتے ہیں۔
اعظم رُشدی چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔)

یوسف: عائشہ! یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟

عائشہ: اس مکان میں جہاں میری زندگی بیتی ہے، جہاں ایک بوڑھا باپ

اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی کا انتظار کر رہا ہے۔ (بے تابی کے عالم میں) ابا جان!

اعظم : عائشہ! میری بچی، تو آگئی؟

عائشہ : ہاں، ابا جان!

اعظم : میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا میری بچی! موت دروازے پر دستک دے رہی ہے، پر تجھ سے ملے بغیر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ شکر ہے تو آگئی!

یوسف : آپ، آپ عائشہ کے باپ ہیں؟

اعظم : یوسف بیٹا! میں نے تجھے نہیں بتایا تھا کہ جس لڑکی کو تو نے جنگل میں بچانا چاہا تھا، وہ میری بیٹی ہے، بیٹا! تو نے کہا تھا میں ملک و ملت کی خدمت کے لیے جا رہا ہوں، تیرا مقصد بڑا بلند تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تو اس مقصد سے ہٹ کر اپنی زندگی میری بچی کی تلاش میں صرف کر دے۔

یوسف : چچا جان! آپ نے مجھے ملک و ملت کی خدمت کا نیا جذبہ دیا ہے۔

اعظم : اللہ تیرے اس جذبے کو ہمیشہ زندہ رکھے! یوسف بیٹا! میری بیٹی تیرے سپرد ہے، خدا حافظ!

(یوسف، چچا جان! اور عائشہ، ابا جان کہتی ہے)

عائشہ : (روتے ہوئے) یوسف! میں نے بہت کچھ پایا اور بہت کچھ کھو بھی دیا۔

یوسف : زندگی کھونے اور پانے کا نام ہے۔ یہ کبھی تو شیشے کی طرح صاف، شفاف اور تابناک ہے اور کبھی سنگ کی طرح سخت، کرخت اور بوجھل۔

عائشہ : مگر جب شیشہ ٹوٹ جائے، تو اس کی کرچیں بھی آدمی کو زخمی کر دیتی ہیں۔

یوسف : زخم کھا کھا کر جینا ہی تو انسانی عظمت ہے۔ زخم کھانا اور مسکرانا، اسی میں زندگی کا جلال و جمال ہے۔ عائشہ، اسی میں زندگی

کا سارا حُسن ہے، ساری بلندی اور رفعت ہے۔

(عائشہ کی سسکیاں)

▽

فاتحِ قسطنطُنیہ

کردار:

سلطان محمد ثانی ——

خلیل پاشا ——

ایلچی —— قسطنطین کا پیغامبر

قیصر —— قسطنطین، حاکم قسطنطنیہ

آرک بشپ ——

آغا حسن ——

اربان ——

عبد اللہ ——

○

(افتتاحی موسیقی)

(۱۴۵۶ء ہجری ترکی کے دارالحکومت ادرنہ (ایڈریانوپل) کا شاہی محل۔ ملاقات کا کمرہ۔ سلطان محمد خاں ثانی (اپنے وزیر اعظم خلیل پاشا سے گفتگو کر رہا ہے)

سلطان : خلیل پاشا!

خلیل پاشا : فرمایئے سُلطانِ معظّم!

سلطان : آج صبح میں نے تیسری بار وہ آواز سُنی ہے، جس نے صاف طور پر میرا نام لیا ہے۔

خلیل پاشا : حضور! آپ نے پہلے بھی ایک مرتبہ اِس آواز کا ذکر کیا تھا۔ یہ آواز کہاں سے آتی ہے اور کون پکارتا ہے آپ کو؟

سلطان : یہ میں نہیں جانتا! مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اِس آواز میں بڑا وقار اور دبدبہ ہے۔ آج صبح کا واقعہ ہے میں نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ وہ آواز نہ جانے کہاں سے ہوا کا دامن چیرتی ہوئی میرے کانوں میں پہنچ گئی اور مجھ پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔

خلیل پاشا : یہ کوئی غیبی آواز ہے کیا؟

سلطان : یقیناً، لگتا ہے میں کوئی فرض بھلا بیٹھا ہوں یا مجھے کوئی قرض ادا کرنا ہے۔

خلیل پاشا : ہو سکتا ہے یہ آپ کے اپنے دل کی آواز ہو۔

سلطان : یہ بھی ہو سکتا ہے مگر وہ کونسا فرض ہے جو مجھے ادا کرنا ہے اور

جو میں اب تک نہیں کر سکا یا جس کی مجھے تیاری کرنی چاہیے؟

غلیل پاشا: حضور! آپ کے ذمّے ایک فرض نہیں، بہت سے فرائض ہیں۔ آپ اُس مراد خاں کے بیٹے ہیں، جنھوں نے ترکی کی سلطنت میں بیش بہا اضافہ کیا تھا۔ جس کا نام سن کر یورپ کے عیسائی حکمران کانپ جاتے تھے۔ اور میں ترکی کے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے ایک اور بات بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

سلطان: کونسی بات!

غلیل پاشا: یورپ کے حکمرانوں خاص طور پر قسطنطنیہ کے والیِ تخت و تاج کا خیال ہے کہ حضور کی عمر صرف اکیس برس ہے۔ ایک حکمران کے لیے یہ عمر بہت کم تصوّر کی جاتی ہے۔

سلطان: غلیل پاشا! تم نہیں جانتے۔ میں نے اس وقت بھی حکومت کا انتظام سنبھال لیا تھا، جب میری عمر فقط پندرہ برس کی تھی۔

غلیل پاشا: آپ کے والدِ گرامی قدر نے سلطنت کی ساری ذمّے داری آپ کے سپرد کر دی تھی، مگر یہ انتظام عارضی تھا۔

سلطان: عارضی نہ بھی ہوتا اور بابا جان، دوبارہ امورِ سلطنت نہ سنبھالتے، جب بھی کوئی فرق نہ پڑتا، میں جن تجربات سے گزر چکا ہوں، انہوں نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔

غلیل پاشا: میں حضور کے علم میں فقط یہ چیز لانا چاہتا تھا کہ بعض حکمرانوں کا نقطۂ نظر کیا ہے اور وہ کیا سوچ رہے ہیں؟

سلطان: غلیل پاشا!

غلیل پاشا: جناب ارشاد فرمائیے۔

سلطان: تم نے شاید درست ہی کہا ہے کہ یہ میرے اپنے دل کی آواز ہے۔ ایک بار بابا جان نے مجھے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثِ اقدس کے یہ الفاظ سنائے تھے کہ تم ضرور قسطنطنیہ فتح کرو گے۔ اور اس کا امیر بھی خوب ہے۔ نیز

انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا، اُس کو اللہ نے بخش دیا ہے۔ یہ الفاظ میرے دل میں اُتر گئے تھے اور میں نے اس لمحے عہد کر لیا تھا کہ زندگی نے وفا کی تو قسطنطنیہ کو سلطنتِ عثمانیہ کا حصّہ بنا دُونگا۔

خلیل پاشا: انشاء اللہ مگر......

سلطان: خلیل، تم شاید یہی کہہ گئے کہ یہ بہت کٹھن مرحلہ ہے۔

خلیل پاشا: مجھے اس سلسلے میں کچھ تاریخی حقیقتوں کا خیال آ گیا ہے۔ قسطنطنیہ فتح کرنے کی آرزو ملتِ اسلامیہ کی بڑی پُرانی آرزو ہے۔ حضور کو علم ہے کہ سب سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے ایک لشکر روانہ کیا تھا۔ جس میں جلیل القدر اصحابِ رسولؐ بھی شامل تھے۔ اس لشکر میں حضرت ایّوب انصاریؓ بھی تھے جو اسلامی لشکر کے ساتھ واپس نہیں آ سکے تھے اور قسطنطنیہ ہی میں کہیں آسودۂ خواب ہو گئے تھے۔ سات بار اور قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن ابھی تک ہماری آزمائش کا دَور ختم نہیں ہوا۔ خود آپ کے بابا جان نے بھی اس شہر پر حملہ کیا تھا۔ مگر قیصر نے اطاعت قبول کر کے بھی دھوکا دیا تھا۔

سلطان: مجھے اِن سب حقیقتوں کا علم ہے خلیل پاشا، لیکن قسطنطنیہ فتح ہوگا۔

خلیل پاشا: خدا کرے یہ سعادت آپ کے حصّے میں آئے۔

سلطان: خلیل! یہ آواز جو تیسری بار میرے دل میں گونجی ہے مجھے آمادۂ عمل کر رہی ہے۔

خلیل پاشا: ہو سکتا ہے قدرت فتح کی کُنجی آپ کے ہاتھ میں دے دے!

(حاجب عبداللہ آتا ہے۔)

سلطان: کیوں عبداللہ!

عبداللہ: قیصر کی طرف سے ایک ایلچی آیا ہے۔

سلطان: قیصر قسطنطین کی طرف سے!

عبداللہ: جی حضور!

خلیل پاشا: مجھے اجازت ہے؟

سلطان: نہیں خلیل، یہیں ٹھہرو، دیکھتے ہیں یہ ایلچی کیا کہتا ہے۔

(ذرا سا وقفہ)

ایلچی: سلطان محمد خاں ثانی کی خدمت میں قیصر قسطنطین کا ایلچی حاضر ہو کر آداب بجالاتا ہے۔

سلطان: آئیے، خوش آمدید۔

ایلچی: میرے ذمے جو فرض ڈالا گیا ہے اسے ادا کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

سلطان: شوق سے۔

ایلچی: حضور سلطان کو علم ہے کہ ایک ترک شہزادہ قسطنطنیہ میں قیصر کی زیرِ حراست ہے۔

سلطان: ہمیں اس کا علم ہے۔

ایلچی: اور حضور سلطان یہ بھی جانتے ہیں کہ قیدی شہزادے کے سارے اخراجات حکومتِ ترکی پورے کرتی ہے۔

سلطان: کیا اخراجات کی رقم بھیجنے میں التوا ہو گیا ہے؟

ایلچی: نہیں حضور! رقم باقاعدگی سے مل رہی ہے۔

سلطان: پھر اس کا ذکر کیوں کیا گیا؟

ایلچی: قسطنطنیہ کے فرماں روا نے مطالبہ کیا ہے کہ جو رقم بھیجی جاتی ہے، وہ اخراجات کے معاملے میں بہت کم ہے۔ اِس رقم میں خاطر خواہ اضافہ ہو جائے گا تو ہماری یہ دقت دُور ہو جائے گی۔

سلطان: یہ رقم کم ہے؟

ایلچی: ہمارے فرماں روا کا یہی خیال ہے۔

سلطان: دُنیا میں ہر خیال درست نہیں ہو سکتا۔ اور تمہارے فرماں روا کا یہ خیال تو بالکل غلط ہے۔

ایلچی : حضور! میں اس ضمن میں کچھ کہنے کا مجاز نہیں ہوں، البتہ ہمارے فرماں روا نے فرمایا ہے، اگر سلطان رقم میں اضافہ کرنے پر تیار نہیں ہوں گے تو اس کا نتیجہ ہم دونوں کے لیے خوشگوار نہیں ہوگا۔

سلطان : ہم دونوں سے کیا مراد ہے؟

ایلچی : حضور سلطان اور قیصر قسطنطنیہ۔

سلطان : اور نتیجہ کیونکر ناخوشگوار ہوگا؟

ایلچی : مجھے افسوس ہے کہ میں حضور سلطان کے سامنے ایک تلخ بات زبان پر لا رہا ہوں مگر سلطان کو علم ہے کہ ایک ایلچی کو ہر قسم کا فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔

سلطان : تکلف کی کوئی ضرورت نہیں صاف صاف کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔

ایلچی : شہزادے کو آزاد کر دیا جائے گا اور اس کی آزادی سلطان کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ بن سکتی ہے۔ سلطان کو اس کا علم ہے۔

سلطان : بس یہی کچھ کہنا چاہتے تھے؟

ایلچی : جی ہاں۔ ہمارے قیصر کو توقع ہے کہ آپ معاملے کی نزاکت کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔

سلطان : یقیناً پورا پورا خیال رکھیں گے۔ لیکن اپنے قیصر سے جا کر کہہ دو۔ ہم ہر حالت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے سوا ہمیں اور کچھ نہیں کہنا۔ تم جا سکتے ہو!

ایلچی : سلطان کا بہت بہت شکریہ۔

(وقفہ)

سلطان : خلیل! ہمیں قیصر کی نیت میں فتور معلوم ہوتا ہے۔

خلیل پاشا : جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ قیصر چاہتا ہے کہ آپ شہزادے کی طرف سے فکر مند ہو جائیں اور قسطنطنیہ پر کبھی حملہ کرنے کا خیال بھی ذہن میں نہ لائیں۔

سلطان : اگر قسطنطنیہ پر حملہ نہ ہو سکا تو ہم سمجھیں گے کہ اپنی ساری زندگی اکارت جارہی ہے اور ہم نے اُن روایات کا احترام نہیں کیا جو ہمارے جدِ امجد کی طرف سے ہم تک پہنچی ہیں۔

خلیل پاشا : آپ نہ صرف ان روایات کا احترام کریں گے بلکہ ان میں اضافہ بھی کریں گے۔

سلطان : تو حملے کی تیاری آج سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے شروع ہو جانی چاہیے۔

(تیز موسیقی)

قیصر قسطنطین کا دربار

قیصر : (آواز میں گھن گرج) کیا ادرنہ سے ایلچی واپس نہیں آیا؟

ایلچی : جی میں حاضر ہوں۔

قیصر : کیا سلطان نے ہمارا مطالبہ منظور کر لیا ہے؟

ایلچی : جی نہیں۔

قیصر : تم نے سلطان کو بتا دیا تھا کہ ہمارا مطالبہ منظور نہ کرنے پر ہمارا اقدام کیا ہوگا؟

ایلچی : بتا دیا تھا۔

قیصر : تم نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ترک شہزادے کو آزاد کرنے کا مطلب کیا ہوگا؟

ایلچی : واضح طور پر بتا دیا تھا۔

قیصر : (گرج کر) تو پھر کیا کہا تھا سلطان نے؟

ایلچی : حضور! سلطان کی عمر ایک حکمران کی حیثیت سے بہت تھوڑی ہے مگر حیرت ہے کہ عمر کی کمی کے باوجود اس میں جرأت مندی کی کمی نہیں ہے۔

قیصر : کیا سلطان خوف زدہ نہیں ہوا؟

ایلچی : خوف زدہ ہونے کی بجائے اُس نے کہا ہے کہ ہم ہر حالت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

قیصر : وہ بہت جلد اس حماقت آمیز جرأت کا مزا چکھ لے گا۔ جاؤ شہزادہ ارخاں کو قید خانے سے باہر نکال کر یہاں لے آؤ۔

(آرک بشپ آتا ہے)

آرک بشپ : (آواز میں وقار) نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔

قیصر : محترم فادر بشپ! حضور نے کیوں زحمت فرمائی۔ میں حاضر ہو جاتا۔

آرک بشپ : قسطنطین! آپ تُرک شہزادے کو رہا کرنا چاہتے ہیں؟

قیصر : جی ہاں۔ تُرک سلطان بہت خود سر ہو گیا ہے۔ اُس نے ہماری دھمکی کی کوئی پروا نہیں کی۔ ہم تُرک شہزادے کو فوراً رہا کر دیں گے۔

آرک بشپ : رہائی کا مطلب؟

قیصر : شہزادہ ارخاں سلطان کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت بن سکتا ہے۔ لوگوں اور فوج پر شہزادے کا ابھی کافی اثر ہے اس اثر و رسوخ سے فائدہ اُٹھا کر وہ بغاوت کر سکتا ہے اور یہ بغاوت سلطان کو بہت مہنگی پڑے گی!

آرک بشپ : قسطنطین! آپ اس بغاوت سے کیا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں؟ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔ آپ کی اصل منشا کیا ہے۔ سلطان کے اسلاف قسطنطنیہ پر بارہا حملہ کر چکے ہیں مگر اسے فتح نہیں کر سکے۔ سلطان محمد خاں ثانی بھی اپنے بزرگوں کی اس روایات کی پیروی کرے گا۔ اور آپ شروع میں ایک ایسی اُلجھن پیدا کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ حملہ کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ لیکن وہ حملہ کرے بھی تو آپ کا اور قسطنطنیہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

قیصر : فادر! میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔

آرک بشپ : قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے ایک شرط ہے اور یہ شرط سوائے ہمارے خاندان کے افراد کے اور کسی کو معلوم نہیں۔

قیصر : فادر، وہ شرط کیا ہے؟

آرک بشپ : ہمارے بزرگ نے وصیت کی تھی کہ جب تک یہ شرط پوری نہ ہونے لگے اسے کسی کے سامنے بھی بیان نہ کیا جائے۔ ہمارے خاندان میں سے جن لوگوں کو اس کا علم ہے وہ یہ راز کبھی افشا نہیں کریں گے۔ یہ راز ہمارے سینوں میں راز ہی رہے گا۔

قیصر : مگر فادر۔

آرک بشپ : میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کا کوئی انسان بھی اس شرط کو پورا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ یہ شرط کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں۔

ایلچی : فادر! میں ابھی راستے میں ہی تھا کہ میں نے سنا سلطان قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کی زبردست تیاریوں میں مصروف ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے ایک قلعہ بھی بنوانا شروع کر دیا ہے۔

قیصر : قلعہ۔ کہاں؟

ایلچی : یہ قلعہ آبنائے فاسفورس کے ایشیائی ساحل پر بنے گا۔

قیصر : وہاں تو پہلے بھی ایک قلعہ موجود ہے۔

ایلچی : جی ہاں یہ سلطان بایزید نے بنوایا تھا۔ نیا قلعہ اس کے بالمقابل ہوگا۔

قیصر : مقدس فادر! آپ نے سن لیا ہے کہ سلطان کے ارادے کیا ہیں؟

آرک بشپ : ایلچی نے میری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ مجھے اس کا علم ہو چکا ہے کہ سلطان قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کی شب و روز تیاریاں کر رہا ہے۔

قیصر : پھر بھی فادر۔

آرک بشپ : پھر بھی خطرے یا فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ قسطنطنیہ کو کوئی ترک حکمران یا کوئی اور حکمران کبھی فتح نہیں کر سکتا۔ جو بھی حملہ کرے گا منہ کی

کھائے گا۔ قسطنطنیہ پر آنچ نہیں آئے گی۔

قیصر: ہم اس قلعے کی تعمیر کو رکوا دیں گے اور اگر اس کے لیے جنگ بھی کرنی پڑی تو ہماری تلواریں میانوں سے باہر نکل آئیں گی۔

(منظر بدلتا ہے۔ تلواروں کی جھنکار۔ جنگ کا شور۔ سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپ۔ اس شور میں سلطان کی آواز ابھرتی ہے)

سلطان: کیا ہے آغا حسن۔

آغا حسن: قیصر نے قلعے کی تعمیر روکنے کا حکم دیا تھا۔

سلطان: وہ کون ہوتا ہے حکم دینے والا! تم فوج کے سپہ سالار ہو۔ کیا تم نے کوئی کارروائی نہیں کی؟

آغا حسن: جب تعمیر جاری رہی تو اس کی فوج نے معماروں پر حملہ کر دیا۔

سلطان: معماروں پر حملہ کر دیا۔ بزدل۔ کم ظرف۔ (شور تھم چکا ہے)

آغا حسن: ہمارے سپاہی تیزی سے وہاں پہنچ گئے اور اب باقاعدہ جنگ ہو رہی ہے۔

سلطان: قیصر نے پہل کی ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اب اپنی دیرینہ آرزو کے پورا کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ آغا حسن تم خود جاؤ۔ یہ پہلا معرکہ ایسا ہونا چاہیے کہ قیصر کو معلوم ہو جائے کہ ترک سپاہی کمزور نہیں ہیں۔ وہ ہر مقام پر، ہر حالت میں اور ہر فوج سے جنگ کر سکتے ہیں۔ نہ صرف جنگ کر سکتے ہیں بلکہ دشمن کو عبرت ناک شکست بھی دے سکتے ہیں۔

آغا حسن: جیسا حکم۔

(ذرا سا وقفہ جس میں تیز موسیقی جاری رہتی ہے)

سلطان: کیوں آغا حسن! واپس آگئے ہو؟

آغا حسن: میرے جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

سلطان: کیوں؟

آغا حسن : قیصر نے شہر کا دروازہ بند کر دیا ہے اور حملہ آور فوج کو روک دیا ہے۔

سلطان : لیکن قیصر کی اس کارروائی نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کی نیت نیک نہیں ہے۔ اس کا وجود ہمارے لیے ایک زندہ خطرہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس خطرے کو دور کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔

آغا حسن : اور وہ طریقہ ہے فوجی تیاری۔

سلطان : آغا حسن!

آغا حسن : حضور سلطان!

سلطان : تم نے ایک مرتبہ ہمیں بتایا تھا کہ ہنگری کا ایک انجنیئر ہمارے یہاں موجود ہے۔

آغا حسن : یقیناً ہے۔ اُربان، اُس کا نام ہے اور ہماری فوج میں ملازم ہے۔

سلطان : ہم آج ہی اُس سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

آغا حسن : حضور کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔

(موسیقی)

عبداللہ : حضور! اُربان نامی انجنیئر شرفِ باریابی کا آرزو مند ہے۔

سلطان : اِسی لمحے بلاؤ۔

(ذرا سا وقفہ)

اُربان : خادم آداب بجا لاتا ہے۔

سلطان : آؤ اُربان۔ ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔

اُربان : ارشاد حضورِ عالی!

سلطان : اُربان! ہم سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تم کس معاملے میں اپنا کمالِ فن دکھا سکتے ہو۔

اُربان : حضور! مجھے توپ بنانے کا خاصا تجربہ ہے۔

سلطان : تو آج سے تمہارے سپرد فقط ایک کام ہے اور یہ کام ہے

توپ بنانا۔ اِس کے علاوہ تم سے کوئی کام نہیں لیا جائے گا۔

اُربان: غرض یہ ہے کہ ایک تو مجھے ضرورت کا سامان مہیّا کر دیا جائے اور چند کاریگر بھی جو میری ہدایات پر عمل کریں۔

سلطان: تمہیں تمہاری ہر ضرورت کی چیز مہیا کی جائے گی۔ ہاں ایک بات کا خیال رہے۔

اُربان: فرمائیے حضور۔

سلطان: تمہارے سپرد جو کام کیا گیا ہے ایک تو اسے بہت جلد مکمل ہونا چاہیے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ کام خفیہ طور پر کرنا ہے۔

اُربان: بہتر حضور! (وزیرِ اعظم خلیل پاشا آتا ہے۔)

سلطان: آؤ خلیل پاشا۔ کیا خبر لی ہے؟

خلیل پاشا: جاسوس کچھ خبریں لائے ہیں۔

سلطان: خاص خبریں کیا ہیں۔

خلیل پاشا: قیصر نے سمجھ لیا ہے کہ آپ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے ہیں، اس لیے وہ جنگ کی تیاریاں بڑی تیزی سے کر رہا ہے۔ اِس نے شہر کی دیواروں کو مضبوط سے مضبوط تر بنوا لیا ہے۔ دوسرے ملکوں سے کھانے پینے کی چیزیں دھڑا دھڑ منگوانی شروع کر دی ہیں۔ اور سب سے بڑی خبر یہ ہے کہ اس نے سارے یورپ کے عیسائی بادشاہوں کے ہاں اپنے ایلچی بھیجے ہیں اور اِن سے کہا ہے کہ ترک سلطان قسطنطنیہ پر قبضہ جمانے کا تہیّہ کر چکا ہے۔ اگر اِس وقت اسے بچایا نہ گیا تو قسطنطنیہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

سلطان: یہ کوئی خلافِ توقع واقعہ نہیں ہے۔

خلیل پاشا: قیصر نے حکومت جنیوا سے بھی مدد کے لیے درخواست دی ہے اور اطلاع ملی ہے کہ حکومت اپنے کمانڈر جان جسٹیانی کو قسطنطنیہ بھیجنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔

سلطان : ہم اس شخص کی بہادری کے قصے سُن چکے ہیں۔ مگر جب وہ ہمارے مدِمقابل آئے گا اس وقت اسے معلوم ہوگا کہ اسے کن بہادروں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

خلیل پاشا : ایک اور خبر بھی ملی ہے۔

سلطان : کیا خبر ہے؟

خلیل پاشا : قیصر نے قلعے کے اِردگرد گہری خندقیں کھدوائی ہیں اور قسطنطنیہ کی بندرگاہ شاخِ زریں کے آگے سمندر میں ایک بہت بھاری زنجیر بھی پھیلا دی ہے۔

سلطان : تاکہ ہمارا کوئی جہاز وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

خلیل پاشا : جی ہاں۔

سلطان : اِن تمام انتظامات کے باوجود خداوندِ ذوالجلال کی رحمت سے قسطنطنیہ فتح ہوگا اور سلطنتِ عثمانیہ کا حصّہ بنے گا۔

خلیل پاشا : انشاء اللہ۔

سلطان : خلیل پاشا!

خلیل پاشا : جی حضور!

سلطان : کیا ہماری کشتیاں آبنائے فاسفورس میں تیار کھڑی ہیں؟

خلیل پاشا : بالکل تیار ہیں۔

(موسیقی جو ایک دم تیز ہو جاتی ہے)

سلطان : کیا ہوا ہے؟

آغا حسن : دشمن کے چار جہاز سامانِ رسد لا رہے ہیں۔

سلطان : اس وقت کہاں ہیں؟

آغا حسن : بحرِ مارمورا میں سے گزر کر آبنائے فاسفورس میں داخل ہو گئے ہیں۔

سلطان : تو کیا ابھی تک اُن پر حملہ نہیں ہوا۔ چلو میں چلتا ہوں۔

(پانی کا طوفان۔ بڑے بڑے پتھروں کے گرنے کا شور بھڑکتی ہوئی آگ کا شور)

آغا حسن : حضور پیچھے ہٹ جائیں۔ پتھر چاروں طرف سے برس رہے ہیں۔
سلطان : خدا حفاظت کرنے والا ہے۔ ہماری کشتیاں آگے کیوں نہیں بڑھ رہیں؟
آغا حسن : دشمن کے جہاز ہماری کشتیوں کے مقابلے میں بہت بڑے ہیں اور اِن سے مسلسل پتھر اور آگ برس رہی ہے۔
سلطان : پھر کیا ہوا؟ اِن جہازوں کو گھیرے میں لے لینا چاہیے۔
آغا حسن : حضور سلطان! واپس آ جائیں۔ آگے مت جائیں۔ حضور سلطان حضور!

(دریائی کا طوفان بہت بڑھ جاتا ہے۔ اِس طوفان میں سلطان کی آواز اُبھرتی ہے)

سلطان : شاباش بہادرو! روک لو قیصر کے جہازوں کو۔ روک لو مرحبا! شاباش۔
آغا حسن : سلطان حضور!
سلطان : آغا تم واپس جاؤ۔
آغا حسن : سلطان معظم! آپ بہت خطرناک مقام پر آ گئے ہیں۔ یہاں پتھروں کی زیادہ بارش ہو رہی ہے۔ آگ کے شعلے اِدھر آ رہے ہیں۔
سلطان : شاباش۔ غازیو۔ دلیرو۔ اوہ۔ میرے اللہ۔
آغا حسن : سلطان حضور! سلطان حضور!

(طوفان ختم جاتا ہے۔ شور ختم ہو گیا ہے۔ سلطان ایک خیمے کے اندر زخمی حالت میں پڑا ہے)

خلیل پاشا : ابھی ہوش نہیں آیا؟
آغا حسن : ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں۔ اور پکارنے لگے تھے "بہادرو! جہازوں کو روک دو"
خلیل پاشا : سلطانِ معظم! (ذرا بلند آواز سے) سلطانِ معظم! سلطانِ معظم!

سلطان : جہاز رُک گئے ہیں۔ (خلیل اور حسن دونوں خاموش رہتے ہیں) کیا جہاز رُکے نہیں؟

حسن پاشا : حضور سلطان!

سلطان : ہم کیا پوچھ رہے ہیں؟

خلیل پاشا : حضور! اس وقت آپ کی صحت زیادہ مقدم ہے۔

سلطان : مَیں ٹھیک ہوں۔ صحیح صحیح بتاؤ۔

خلیل پاشا : حضور! دشمن کے جہاز ہماری کشتیوں کے مقابلے میں بہت بڑے تھے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ مگر ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی کشتیوں کو آگ اور دھوئیں میں دیکھ کر اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا تھا۔ خوش قسمتی سے ہمارے سپاہی وہاں پہنچ گئے اور آپ کو بے ہوشی کے عالم میں ساحل پر لے آئے۔

سلطان : اللہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا ہے۔

خلیل پاشا : حضور نے بالکل درست فرمایا ہے۔

سلطان : قلعہ مکمل ہو چکا ہے؟

حسن پاشا : مکمل ہو گیا ہے۔

سلطان : اُربان نے اب تک کیا کیا ہے؟

حسن پاشا : وہ اپنے کام میں مصروف ہے۔

سلطان : ہم اُس کے پاس جانا چاہتے ہیں۔

حسن پاشا : حضور ذرا توقف فرمائیں۔ ابھی آپ بہت کمزور ہیں۔

سلطان : حسن پاشا! کام بہت طویل ہے اور زندگی بہت مختصر ہے۔ ان زخموں کا کیا ہے۔ ہم آج ہی بلکہ اسی وقت اس کی کارگاہ میں جانا چاہتے ہیں۔

(وقفہ موسیقی)

اُربان : حضور آپ کیوں تشریف لائے۔ بندہ حاضر ہو جاتا۔

سلطان : اُربان! کیا ابھی تک یہی توپیں تیار ہوئی ہیں؟

اُربان : جی ہاں۔

سلطان : اُربان ! تُم نے یا تو ہمارا مطلب نہیں سمجھا یا ہم سمجھا نہیں سکے۔

اُربان : حضور ! ابھی اور توپیں بنیں گی۔ رات دن کام ہو رہا ہے۔

سلطان : یہ توپیں اچھی ہیں اور ہم ان سے ضرور فائدہ اُٹھائیں گے مگر تم جانتے ہو ہمارے قلعے اور قسطنطنیہ کے قلعے کی دیواروں کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔

اُربان : جی کافی فاصلہ ہے۔

سلطان : کیا یہ چھوٹی توپیں اپنے گولے اُن دیواروں تک پہنچا سکیں گی ؟

(اُربان خاموش رہتا ہے)

سلطان : اُربان ! تم نے جو کچھ کیا ہے ہم اُس پر بہت خوش ہیں اور تمہارے ممنون ہیں۔

اُربان : سلطانِ معظم ! اپنے اس غلام کو شرمندہ نہ کریں۔

سلطان : ہم چاہتے ہیں کہ ایک ایسی توپ بناؤ جس کا دہانہ انتہائی وسیع ہو کہ اس میں سے بہت بڑا اور وزنی گولہ نکل کر دشمن کے قلعے کی دیواریں شگاف ڈال دے کیا تم ایسی توپ بنا سکتے ہو ؟

اُربان : بنا سکتا ہوں حضور !

سلطان : تو اس وقت کام شروع کر دو۔ شاباش۔

(ذرا سا وقفہ)

سلطان : خلیل پاشا !

خلیل پاشا : حضور سلطان !

سلطان : توپ انشاء اللہ بہت جلد بن جائے گی۔ اسے قلعے کی بلندی پر پہنچانا ہوگا تاکہ وہاں سے گولہ باری ہو سکے، لیکن جس حملے کی تیاری ہم کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے صرف بڑی توپ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو بیڑا موجود ہے وہ چھوٹی کشتیوں پر مشتمل ہے اور یہ کشتیاں بھی تعداد میں زیادہ نہیں ہیں۔

خلیل پاشا: درست ہے حضور!

سلطان: قسطنطنیہ کے قلعے کا محاصرہ کرنے کے لیے ایک بہت مضبوط بیڑے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ بیڑہ ہماری ذاتی نگرانی میں تیار ہوگا۔

خلیل پاشا: بہتر حضور!

(موسیقی جو مسلسل گولہ باری کے شور میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ چند لمحے یہ ہنگامہ جاری رہتا ہے گولہ باری ختم جاتی ہے)

خلیل پاشا: گولہ باری سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

سلطان: کوئی فائدہ نہیں ہوا؟

خلیل پاشا: قسطنطنیہ کے قلعے کی دیواروں پر گولے لگنے سے جو شگاف ہوئے تھے وہ یونانی فوج نے پُر کر دیئے ہیں۔

سلطان: اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری یہ کوشش کہ بہت بڑی توپ سے گولے برسائے جائیں، کارگر نہیں ہوئی۔

خلیل پاشا: سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ بندرگاہ شاخِ زرّین اور باسفورس کے درمیان کم و بیش پانچ میل کا فاصلہ ہے اور وہاں خشکی ہے۔ یعنی ہمارے جہاز وہاں سے کسی صورت بھی نہیں گزر سکتے۔ اگر جہازوں کے ذریعے ہمارے سپاہی بندرگاہ میں داخل ہو سکتے تو قسطنطنیہ اب تک فتح ہو چکا ہوتا۔

سلطان: خلیل پاشا!

خلیل پاشا: جی سلطان!

سلطان: ہم چاہتے ہیں کہ آج رات ہم تنہا اپنے خیمے میں رہیں۔

خلیل پاشا: جیسا ارشاد مگر۔

سلطان: صبح جب ہم نماز سے فارغ ہو جائیں تو تم آغا حسن کے ساتھ ہمارے پاس پہنچ جاؤ۔ خیمے کے باہر پہرہ لگا دو۔ کسی کو بھی رات کے وقت اندر آنے کی اجازت نہیں ہوگی اور۔ ہاں سپاہیوں سے کہو کہ فتح و نصرت کے لیے دعا مانگیں۔ علما

کی خدمت میں میں خود دُعا کی درخواست کروں گا۔ جاؤ اب تم۔

(ہلکی موسیقی جو سلطان کے دُعائیہ الفاظ میں ڈوب جاتی ہے)

سلطان: یارب ذوالجلال! یہ تیرا عاجز بندہ ایک ایسی مہم سر کرنا چاہتا ہے۔ جو اب تک سر نہیں ہو سکی۔ اپنے اس عاجز بندے کو قسطنطنیہ فتح کر کے اسے سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنانے کی توفیق دے۔ تیرا فضل و کرم شامل ہو گا تو اسلام کے سپاہیوں کو جنگ میں ضرور فتح ہو گی! بس تیری ہی پاک ذات پر بھروسہ ہے۔ صرف تیری ذات پر۔

(دُعا کے آخری الفاظ پر سناٹا چھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دُور سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد خلیل پاشا کی آواز آتی ہے)

خلیل پاشا: حضور سلطان! ہم حسب ارشاد حاضر ہو گئے ہیں۔

سلطان: آؤ خلیل۔ آؤ حسن آغا۔

آغا حسن: خدا کا شکر ہے کہ آج آپ کی آواز میں پہلی سی افسردگی اور فکرمندی نہیں ہے۔

سلطان: آغا حسن! اللہ نے اس نہایت مشکل وقت میں ہماری راہنمائی کی ہے۔ ہم نے منصوبہ سوچ لیا ہے۔ کل شام کو اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

(موسیقی جو تیز ہو کر مدھم ہو جاتی ہے)

آغا حسن: حضور! آپ کے ارشاد کی تعمیل میں بندرگاہ شاخِ زریں تک لکڑی کے بڑے بڑے تختے بچھوا دیے گئے ہیں۔

سلطان: کیا ان پر چربی لگا دی گئی ہے؟

آغا حسن: جی ہاں۔

سلطان: وہ کشتیاں کہاں ہیں، جنھیں ہم نے مہیا کرنے کا حکم دیا تھا؟

خلیل پاشا : وہ رہیں اور بیل بھی آگئے ہیں۔

سلطان : اب یوں کرو بیلوں کے ذریعے لکڑی کے تختوں کے اُوپر سے گزار کر ان تمام کشتیوں کو بندرگاہ تک پہنچا دو۔ ایک لمحہ بھی غارت نہیں ہونا چاہئے دیکھو قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔ ہوا بہت تیز ہے۔ تیز ہوا کے یہ جھونکے کشتیوں کی بڑی مدد کریں گے۔ اور پھر چاندنی رات بھی ہے۔ روشنی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اک دم مہم شروع کر دی جائے۔

(گھڑ گھڑ کا شور جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جاتا ہے اس شور میں آرک بشپ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھرتی ہے)

آرک بشپ : قیصر!

قیصر : کیا ہے مقدس فادر!

آرک بشپ : اب دنیا کی کوئی طاقت قسطنطنیہ کو شکست سے نہیں بچا سکتی۔

قیصر : کیوں فادر!

آرک بشپ : میں نے آپ کو بتایا تھا کہ جب تک ایک شرط پوری نہیں ہوگی دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی قسطنطنیہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتی۔

قیصر : مگر آج کیا ہوا ہے؟

آرک بشپ : قسطنطنیہ کو وہی شخص فتح کر سکتا تھا جو خشکی پر کشتیاں چلا دے۔ اور میری آنکھیں یہ منظر دیکھ چکی ہیں۔ سلطان محمد خاں کی کشتیاں فاسفورس سے لیکر بندرگاہ تک خشکی پر چل رہی ہیں۔ ان آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا۔ کشتیاں خشکی پر چل رہی ہیں۔

قیصر : کشتیاں خشکی پر؟

آرک بشپ : دیکھ لو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ آج سمجھ لو قسطنطنیہ تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ آج سمجھ لو کہ سلطان محمد خاں فاتح قسطنطنیہ ہے۔ آج قدرت نے تمہارے ماتھے پر شکست کی سیاہی پھیر دی ہے۔ وہ دیکھو سلطان کے سپاہی قلعے

کی دیوار پر چڑھ گئے ہیں۔ اب قلعے کے دروازے کھل جائیں گے۔ ابھی سلطان کے سپاہی قسطنطنیہ کے بازاروں اور گلیوں میں آجائیں گے۔ قسطنطنیہ کی بازنطینی سلطنت ختم ہوگئی۔ آج ختم ہوگئی۔

(نعرۂ تکبیر کا ہنگامہ بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ جب یہ ہنگامہ ذرا تھمتا ہے)

عبداللہ: (آواز میں پریشانی) حضور سلطان کہیں نہیں ہیں۔

خلیل پاشا: کیا کہا عبداللہ؟

عبداللہ: پتہ نہیں حضور کہاں چلے گئے ہیں؟

خلیل پاشا: تم ان کے ساتھ تھے؟

عبداللہ: میں اُن کے ساتھ رہا ہوں مگر تھوڑی دیر بعد پہلے مجھ سے کہنے لگے۔ عبداللہ تم چلے جاؤ۔ مجھے یہاں تنہا چھوڑ دو۔

خلیل پاشا: وہ خود کہاں گئے ہیں؟

عبداللہ: میں نہیں جانتا۔

خلیل پاشا: کس جگہ انہوں نے تم سے چلے جانے کے لیے کہا تھا؟

عبداللہ: فصیل کے نیچے۔

خلیل پاشا: وہ تنہا تھے؟

عبداللہ: جی ہاں۔

خلیل پاشا: دیکھو عبداللہ! کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ یہیں کہیں ہوں گے۔ ابھی مل جائیں گے۔ ہم بڑی جلدی انھیں ڈھونڈ لیں گے۔

عبداللہ: میں بھی اُن کی تلاش میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔

خلیل پاشا: چلو۔

(ہلکی ہلکی موسیقی)

عبداللہ: وہ دیکھئے۔ ایک سایہ سا۔

خلیل پاشا: سلطانِ معظم، سلطانِ معظم! حضور سلطان آپ یہاں۔

سلطان: کون خلیل پاشا۔

خلیل پاشا: جی ہاں۔ حضور سلطان اس ویرانے میں کیا کر رہے ہیں؟

سلطان: خلیل! قدرت کے کام بڑے پُراسرار ہوتے ہیں۔ انھیں سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ میں نے ایک بار تم سے کہا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک آواز میرا نام لے کر مجھے پکارتی ہے۔ جب قسطنطنیہ فتح ہو گیا تو میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ حضرت ایوب انصاریؓ کے مزارِ مقدس پر حاضری دوں۔ وہی آواز پھر آئی اور میں اس آواز کے پیچھے پیچھے چلتا گیا اور یہاں تک پہنچ گیا۔ خلیل! یہی وہ خاک ہے جس کے نیچے ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت ایوب انصاریؓ آسودہ خواب ہیں۔ اس خاک کے ذرے میں نے اپنی آنکھوں سے لگائے ہیں۔ اور حضرت ایوب انصاریؓ کی خدمت میں عرض کی ہے کہ رسولِ خدا سے کہہ دیں کہ ان کی پیشین گوئی پوری ہو گئی ہے قسطنطنیہ فتح ہو گیا ہے۔ قسطنطنیہ آج عثمانی سلطنت کا حصہ بن گیا ہے۔ قسطنطنیہ آج ان کے غلاموں کی قلمرو میں شامل ہو گیا ہے۔ قسطنطنیہ ہمارا ہے۔ قسطنطنیہ ہمارا رہے گا۔

(اختتامی موسیقی)

نواب سراج الدولہ

کردار

نواب علی وردی	ـــــــ سراج الدولہ کا نانا
آمنہ	ـــــــ نواب علی وردی کی بیٹی۔ سراج الدولہ کی ماں
میر مدن	ـــــــ سراج الدولہ کا قابلِ اعتماد، وفادار فوجی افسر
مانک چند	ـــــــ غدارِ وطن
امی چند	ـــــــ غدارِ وطن
جگت سیٹھ	ـــــــ غدارِ وطن
لارڈ کلائیو	ـــــــ انگریزی افواج کا سپہ سالار
میر جعفر	ـــــــ سراج الدولہ کا غدار سپہ سالار
لیلےٰ	ـــــــ آمنہ کی خادمہ

○

(زمانہ ۱۷۵۶ء مرشد آباد کے شاہی محل کے دیوانِ خاص میں بنگال کا بوڑھا نواب علی وردی خاں بسترِ علالت پر پڑا ہے۔ اس وقت اُس کے پاس اُس کی محبوب بیٹی آمینہ بیگم کے سوا اور کوئی نہیں ہے)

نواب علی وردی: (آواز میں متانت) بیٹی آمینہ!

آمینہ: جی ابا جان!

نواب: میرے قریب آؤ — اور قریب یہ تمہارے رُخساروں پر دھبے سے کیسے ہیں۔ روتی رہی ہو جانِ پدر؟

آمینہ: نہیں ابا جان۔

نواب: آمینہ بیٹی! تمہاری آنکھیں جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ دل مضبوط کرو بیٹی! یہ وقت ہر انسان پر آتا ہے اور میں تو بڑا خوش قسمت ہوں کہ زندگی کے آخری لمحوں تک اپنے وطن کے دشمنوں سے لڑتا رہا ہوں۔ آنسو پونچھ لو۔

آمینہ: اچھا ابا جان۔

نواب: یہ تکیہ ذرا آگے کھسکا دو، میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔

آمینہ: نہیں ابا جان آپ لیٹے رہیں۔

نواب: اب تو لیٹے ہی رہنا ہے (سراج الدولہ آتا ہے) آ گئے سراج بیٹا مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔

سراج الدولہ: نانا جان! میں حاضر ہوں۔

نواب: سراج بیٹا میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے بڑے غور سے سُنو۔

میرا وقت پُورا ہو چکا ہے۔ زندگی کی آخری گھڑیاں ختم ہو رہی ہیں۔ میں بنگال کی حکومت تمہارے سپُرد کیے جا رہا ہوں۔ جب تک اِن ہاتھوں میں سکت رہی تلوار نہیں چھوڑی۔ میری پوری زندگی فرانسیسیوں اور مرہٹوں کے خلاف جنگ و جدل میں گزری ہے۔ علی وردی کا نام سُن کر اُن کے دِل سینوں میں دہل جاتے تھے۔ شاید وہ تمہاری طرف آنکھ اُٹھانے کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔ مگر بیٹا!

سراج الدولہ : فرمائیے نانا جان۔

نواب : تمہیں ایک خاص دشمن کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

سراج الدولہ : آپ کی مراد انگریز سے ہے؟

نواب : ہاں بیٹا! یہ دشمن اتنا بہادر نہیں، جتنا فریب کار ہے۔ اس کی چالیں بڑی گہری اور خوفناک ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا سب سے بڑا اور حقیقی دشمن یہی انگریز ہے۔ تمہاری زندگی کا واحد مقصد اپنے وطن کی حفاظت ہے۔ اس فرض کو کسی حالت میں بھی نہ بھولو۔ یہ نہ بھولو کہ تم ایک بہادر سپاہی کے نواسے ہو اور یہ بھی نہ بھولو کہ تمہاری زندگی تمہارے اپنے وطن کے لیے ہے۔

سراج الدولہ : نانا جان! مَیں یہ باتیں کبھی نہیں بھولوں گا۔

نواب : شاباش بیٹا! اِن آخری لمحوں میں جو فکر مجھے ستا رہی تھی۔ وہ اب دُور ہو گئی ہے۔ اب میں پورے اطمینان کے ساتھ اپنی جان اپنے پیدا کرنے والے کے سپُرد کر دوں گا۔ خدا حافظ! بیٹی آمنہ! خدا حافظ! سراج بیٹا!

(آمنہ کی سسکیاں)

سراج الدولہ : نانا جان! نانا جان!

(سراج کی آواز اور آمنہ کی سسکیاں موسیقی میں منتقل ہو جاتی ہیں)

(وقفہ)

سراج الدولہ : اماں!

آمنہ : ہاں بیٹا!

سراج الدولہ : اماں میرے لیے دُعا کریں۔

آمینہ : مَیں ضرور دُعا کروں گی۔ اللہ میرے بیٹے کو تمام مقاصد میں کامیاب کرے۔

سراج الدولہ : نہیں اماں! یہ دُعا نہ کیجئے۔ صرف یہ دعا کیجئے کہ میرے بیٹے کو اپنے پیارے وطن کی حفاظت کرنے کی توفیق دے۔

آمینہ : آمین ثمہ آمین۔

سراج الدولہ : اور مَیں دُعا کروں گا کہ خدا آپ کی یہ دُعا قبول کرے —— اماں جان۔

آمینہ : کہو میرے بیٹے۔

سراج الدولہ : آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟

آمینہ : مجھے آج تیرے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جب تو چھوٹا سا تھا تو سُرخ کپڑے پہن کر بھاگتا ہوا میرے پاس آیا تھا اور مَیں نے تجھے اپنی گود میں اُٹھا لیا تھا۔ اُس وقت مجھے یوں محسوس ہوا تھا، جیسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور دنیا کی سب سے بڑی نعمت مجھے مل گئی ہے۔

سراج الدولہ : اماں! ہو سکتا ہے کہ آپ میرا لباس ایکبار پھر سُرخ دیکھیں مگر یہ رنگ سے نہیں میرے اپنے ہی خون سے سُرخ ہو گا۔

آمینہ : جس طرح مَیں نے اُس وقت تیری پیشانی کو بوسہ دیا تھا، میرے ہونٹ اُس عالم میں بھی تیرا ماتھا چوم لیں گے۔

(منظر کی تبدیلی)

سراج الدولہ : ہاں میر مدن، کہو کیا بات ہے؟

میر مدن : آپ کو معلوم ہے حضور کرشن پرشاد ہمارے خزانے سے ایک بہت بڑی رقم چوری کر کے فرار ہو گیا تھا۔

سراج الدولہ : مجھے معلوم ہے اس کی گرفتاری میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟

میر مدن : مجرم کو انگریزوں نے پناہ دے دی ہے۔

سراج الدولہ : وہ کون ہوتے ہیں ہمارے مجرم کو پناہ دینے والے۔ ان سے کہا نہیں گیا کہ کشن پرشاد کو فوراً ہمارے حوالے کر دیں؟

میر مدن : کہا گیا ہے حضور!

سراج الدولہ : انہوں نے کیا جواب دیا ہے؟

میر مدن : واضح طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

سراج الدولہ : گویا وہ اِس واقعے کو اہمیت نہیں دے رہے؟

میر مدن : آثار تو اسی بات کی گواہی دے رہے ہیں۔

(ذرا سا وقفہ)

سراج الدولہ : ہوں تو ان کی نیت نیک نہیں ہے۔

میر مدن : صاف ظاہر ہے۔

سراج الدولہ : میر مدن! میں جانتا ہوں معاملہ کیا ہے۔ ان سفید فام تاجروں نے اس لیے یہ جرأت کی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں بنگال کا دلیر اور شجاع حاکم علی وردی خاں فوت ہو چکا ہے اور اب اس کا جانشین سراج الدولہ ہے جسے وہ اپنی مرضی کے تابع کر سکتے ہیں۔

میر مدن : اُن کا یہی خیال ہے اور ہمارے جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ وہ اپنی تجارتی کوٹھیوں کے اردگرد خفیہ طور پر مضبوط فصیلیں بھی کھڑی کر رہے ہیں۔

سراج الدولہ : نانا جان کی زندگی میں تو انہیں ایسی گستاخی کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

میر مدن : اب ہمت ہو گئی ہے۔

سراج الدولہ : انہیں یہ گستاخی بہت مہنگی پڑے گی۔

میر مدن : آپ کا ارادہ کیا ہے؟

سراج الدولہ : میر مدن! ہم ان تاجروں کو ان کے اس جُرم کی پوری پوری سزا دیں گے۔ اگر انہوں نے یہ سوچا ہے کہ نوجوان سراج الدولہ کو فوجی طاقت کے بل بوتے پر ڈرا دھمکا لیں گے تو یہ اُن کی خام خیالی ہے۔ ہمیں اپنے نانا کے اُس

مقدس لہو کی قسم جو سرزمین بنگال کے چپے چپے پر بہا ہے۔ ہم اُن بدبخت سوداگروں کے سر پر آندھی بن کے چھا جائیں گے۔ سپہ سالار مانک چند کو بلاؤ۔ ہم آج ہی قاسم بازار کی انگریز کوٹھی پر قبضہ کریں گے۔ آج ہی سب کچھ ہو جائے گا۔ آج اور صرف آج۔

(بگل کی آواز، توپوں کی گھن گرج، جنگ کا شور۔ آہستہ آہستہ یہ شور ختم ہو جاتا ہے)

میر مدن: خادم کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو۔

سراج الدولہ: میر مدن! یہ تمہارا اندازِ گفتگو کیا ہے؟ میر مدن کو بھی بات کہنے کے لیے ہماری اجازت کی ضرورت ہے؟

میر مدن: میں اجازت اس وجہ سے طلب کر رہا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا اس سے آپ کو تکلیف ہو گی۔

سراج الدولہ: تمہاری کسی بات سے بھی ہمیں تکلیف نہیں ہوتی۔ تم ہمارے جاں نثار سپاہی ہو۔

میر مدن: آپ نے بڑی جرأت اور بہادری سے کلکتہ فتح کر لیا مگر اس کا انتظام مانک چند کے حوالے کر دیا ہے۔

سراج الدولہ: وہ اس لیے کہ مانک چند ہمارا سپہ سالار ہے۔

میر مدن: مگر مجھے ڈر ہے کہ وہ کسی لالچ میں آکر ان تاجروں سے سازباز نہ کرے۔

سراج الدولہ: میر مدن!

میر مدن: حضور! میرا کام آپ کو خطرے سے آگاہ کرنا ہے اور میں نے کر دیا ہے۔

سراج الدولہ: کوئی فکر نہ کرو۔ ہم مرشد آباد واپس جا رہے ہیں۔ مانک چند ابھی وہیں رہے گا۔ اگر اِن لوگوں نے پھر سر اٹھایا تو اُس کے پاس اتنی فوج ہے کہ وہ انہیں کچل کر رکھ دے۔ (منظر کی تبدیلی)

سراج الدولہ: مانک چند! ہمیں تم پر مکمل اعتماد ہے۔ اور تمہیں فوج کے ساتھ اس مقصد کے لیے کلکتے میں چھوڑا تھا کہ تم اُس کی حفاظت کرو گے۔ ہمیں بتاؤ کہ تم کلکتہ کو چھوڑ کر مرشد آباد میں کیا کرنے آئے ہو؟

مانک چند: حضور آپ کلکتہ فتح کر کے لوٹ آئے۔ آپ کے جانے کے بعد انگریزوں نے اپنی تمام طاقت جمع کر لی اور چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔

سراج الدولہ: کیا تمہارے پاس فوج کی کمی تھی؟

مانک چند: میں نے جم کر مقابلہ کیا اور جب دیکھا کہ ہماری فوج کے ارد گرد حملہ آوروں کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ تو میں نے اپنی فوجوں کو باہر نکال لیا۔ حضور! اگر آپ کی ذاتِ گرامی کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ تو آپ کو جگت سیٹھ اور ادمی چند سے بھی حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ وہ دونوں باریابی کے منتظر ہیں۔

سراج الدولہ: ہونہہ۔ ہم اُن سے بھی ملیں گے۔ تم اور کچھ کہنا چاہتے ہو؟

مانک چند: میں حضور کو ایک اور خطرے سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں یہ دوسرا بڑا خطرہ مغل شہزادے ہیں۔ جو دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک شہزادے کی حکمرانی کا اعلان کیا جائے اور ساری طاقت اُس کے گرد جمع کر دی جائے۔ حضور! احمد شاہ ابدالی اور مغل شہزادے آپ کے لیے زبردست خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اور انگریز اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ حضور! اس خاکسار کا مشورہ تو یہ ہے کہ انگریزوں سے صلح کر لی جائے۔

سراج الدولہ: (غصّے سے) صُلح؟ اور انگریزوں سے؟ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

مانک چند: فیصلہ تو حضور کے اختیار میں ہے ناچیز تو مشورہ ہی دے سکتا تھا۔ اجازت ہو تو ادمی چند اور جگت سیٹھ کو بلوا لیا جائے؟

سراج الدولہ: ہاں۔ انہیں بلوا لو۔ (ذرا وقفہ)

جگت سیٹھ: حضور نواب کی خدمت میں یہ خانہ زاد سلام پیش کرتا ہے۔

ادمی چند: تسلیمات حضور!

سراج الدولہ: تم دونوں کیا کہنا چاہتے ہو؟

ادمی چند : حضور! میرے بزرگوں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ اور میں بھی حضور کا نمک خوار ہوں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ کچھ سائے حضور کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ خطرے کے یہ سائے آپ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو اس وقت آپ کے جاں نثار جانیں تو قربان کر سکیں گے لیکن آئی ہوئی مصیبت ٹال نہیں سکیں گے۔

سراج الدولہ : تم کیا کہتے ہو جگت سیٹھ؟

جگت سیٹھ : موجودہ حالات میں بہتر یہی ہے کہ انگریزوں سے صُلح کر لی جائے۔

سراج الدولہ : اگر صلح نہ کی جائے تو؟

جگت سیٹھ : حضور! ذرا سوچیے آپ کی فوجیں تین طاقتوں کا مقابلہ کس طرح کر سکیں گی۔ ایک طرف احمد شاہ ابدالی اور مغل شہزادے اور دوسری طرف انگریز۔ ہماری رائے ہے کہ آپ انگریزوں کو دوست بنا لیں۔

سراج الدولہ : ہوں۔ تم تینوں کا یہی مشورہ ہے؟

تینوں (بہ یک وقت) جی ہاں۔

سراج الدولہ : ہم تمہارے مشورے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچیں گے۔

(وقفہ)

(رات کا سناٹا۔ ہلکی ہلکی موسیقی)

لیلیٰ : حضور بانو۔ حضور بانو۔ بانو حضور۔

آمینہ : لیلیٰ کیا ہوا۔ اس طرح خوفزدہ کیوں ہو؟

لیلیٰ : بانو حضور۔ ابھی ابھی میں نے دیکھا کہ سامنے باغ میں ایک سایہ سا چلا جا رہا ہے۔

آمینہ : آدھی رات کے وقت ہمارے باغ میں کون آسکتا ہے؟

لیلیٰ : میں سچ کہتی ہوں۔ یہ سایہ میں نے ایک بار نہیں دو تین بار دیکھا ہے۔

آمینہ : میری چادر لاؤ۔

لیلیٰ : آپ خود جائیں گی؟

آمینہ : ہاں۔ میں خود جاؤں گی۔ میں خود دیکھوں گی۔ علی وردی خاں کی بیٹی ہوں، سراج الدولہ کی ماں ہوں۔ میرے لیے خوف کی کوئی بات نہیں۔

(ذرا وقفہ)

دگرج کر) کون ہے؟

سراج الدولہ : امّاں؟

آمینہ : سراج تُو؟

سراج الدولہ : ہاں امّاں میں ہوں۔

آمینہ : بیٹا رات کے وقت تُو یہاں کیا کر رہا ہے؟

سراج الدولہ : کچھ نہیں۔ ٹہل رہا ہوں۔

آمینہ : اس بیتابی کا سبب؟

سراج الدولہ : اس کی وجہ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا۔

آمینہ : تُو مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ اپنی ماں سے کیا چھپائے گا۔ مجھے بتا اس بیتابی کی وجہ کیا ہے؟ سراج بیٹے!

سراج الدولہ : امّاں۔

آمینہ : کہو کہو بیٹے!

سراج الدولہ : میں سو رہا تھا یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے میرا دایاں ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ میں اسی وقت اُٹھ بیٹھا۔

آمینہ : کون تھا وہ؟

سراج الدولہ : کوئی نہیں تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔

آمینہ : کبھی پہلے بھی ایسا ہُوا تھا؟

سراج الدولہ : صرف ایک مرتبہ۔ اور یہ آج سے تین سال پہلے کی بات ہے۔ میں دیر تک باغ میں گھومتا رہا تھا۔ اور پھر وہیں ایک روش پر سو گیا تھا۔ اُس وقت

ایک ہاتھ نے زور سے میرا ہاتھ کھینچا تھا اور میں اسی طرح بیتاب ہو کر اٹھ بیٹھا تھا۔

آمینہ : اُس وقت بھی تیرے پاس کوئی نہیں تھا؟

سراج الدولہ : نہیں اماں جان! اُس وقت تو نانا جان نے میرا ہاتھ کھینچ کر کہا تھا "اُٹھ جاگ بیٹا کہاں سو رہا ہے"۔ مجھے محسوس ہوتا ہے آج بھی انہوں نے ہی میرا ہاتھ کھینچا ہے۔

آمینہ : لیکن تُو نے کوئی غلط قدم تو نہیں اُٹھایا۔

سراج الدولہ : نہیں میں نے اپنے جان نثار مشیروں کے مشورے پر عمل کیا ہے میں نے اپنی دانست میں کوئی غلط قدم نہیں اُٹھایا۔

آمینہ : انگریزوں سے صُلح کر لی ہے یہ تُو نے درست کام کیا ہوگا مگر مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے ایک نو آبادی پر قبضہ کر لیا ہے۔

سراج الدولہ : ہاں یہ فرانسیسی نو آبادی چندر نگر ہے۔

آمینہ : اور میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ ولایت سے ایک بڑا چالاک انگریز آیا ہے جس کا نام لارڈ کلائیو ہے۔

سراج الدولہ : یہ بات میں بھی سُن چکا ہوں۔

آمینہ : تو تیرے نانا جان نے تجھے خطرے سے آگاہ کیا ہے۔

سراج الدولہ : میں اِن کی تمام سازشوں کا مقابلہ کروں گا۔ میں انہیں اپنے ملک سے چلے جانے پر مجبور کر دوں گا۔ ایک مرتبہ انہیں شکست دے چکا ہوں۔ اب شکستِ فاش دوں گا۔ کلائیو کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ میں اپنی فوج کی کمان میر جعفر کے حوالے کر رہا ہوں۔ وہ میرے خاندان کا رُکن ہے اس کی رگوں میں میرے بزرگوں کا لہو رواں ہے۔ میں صبح ہی اِسے سپہ سالار مقرر کر رہا ہوں۔

آمینہ : خدا تمہارا حامی و ناصر ہو میرے بیٹے!

(گزرانِ وقت کے لیے موسیقی)

(لارڈ کلائیو اور ادمی چند مصروفِ گفتگو ہیں)

امی چند : ہاں تو بتائیے لارڈ صاحب آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟

کلائیو : امی چند ہم تم سے بہت خوش ہے۔

امی چند : شکریہ لارڈ کلائیو، بہت بہت شکریہ۔

کلائیو : تم نے بوت اچھا کام کیا ہے۔ تم نے جگت سیٹھ اور مانک چند نے اب ہم چاہتا ہے کہ تم اور کام کرو۔ ہمیں اُمیڈ ہے تم یہ کام بھی جرور کرے گا۔ تم یہ کام کرسکتا ہے۔

امی چند : فرمائیے آپ کیا چاہتے ہیں۔

کلائیو : میر جعفر نواب کا کمانڈر انچیف ہے۔

امی چند : جی ہاں۔

کلائیو : ہم کہنا یہ مانگتا ہے کہ اسے سمجھاؤ ہمارا مطلب ہے ——

امی چند : جو کچھ لارڈ صاحب کہنا چاہتے ہیں، میں نے بخوبی سمجھ لیا ہے۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ اسے ساتھ ملایا جائے۔

کلائیو : ہم یہ کام تم سے کرانا مانگتا ہے۔

امی چند : آپ کو معلوم ہے، میر جعفر نواب کا عزیز بھی ہے۔

کلائیو : ہم سب کچھ جانتا ہے۔ ڈیکھو امی چند ہم اس کے لیے تمہیں بوٹ روپیہ ڈے گا۔ اتنا روپیہ ڈے گا کہ تم مالا مال ہو جائے گا، بولو کیا مانگتا ہے۔

امی چند : آپ بتائیے۔

کلائیو : ہم پانچ لاکھ روپیہ ڈے گا۔

امی چند : شکریہ مجھے جانے کی اجازت دیجیے۔

کلائیو : یہ روپیہ کم ہے، ہم ڈس لاکھ ڈے گا۔ اب کہو؟

امی چند : نہیں لارڈ صاحب!

کلائیو : ہیں کیا باتیں کرتا ہے۔ ڈس لاکھ روپیہ تو تم نے کبھی اپنی آنکھوں سے بھی نہیں ڈیکھا ہوگا۔ اس روپے سے تم آڈھا بنگال خرید سکتا ہے۔ بولو،

بولو کیا کہتا ہے۔

اومی چند : لارڈ کلائیو آپ نے کہہ تو دیا ہے کہ میر جعفر کے من کو بدل دو کہ وہ نواب کو چھوڑ کر آپ کی مدد کرے۔ مگر آپ نے یہ نہیں سوچا کہ یہ کتنا بڑا اور کٹھن کام ہے۔ اگر میر جعفر دریدہ آپ کا ساتھی بن جائے تو نواب شکست کھا جائے گا اور پورا بنگال آپ کے قبضے میں آجائے گا۔ آپ کا میر جعفر کو اپنا ساتھی بنا لینے کا صاف مطلب یہ ہے کہ بنگال کی حکومت آپ کو مل گئی ہے۔ کیا آپ اتنی بڑی حکومت کے لیے جس سے آپ کروڑوں روپے حاصل کریں گے اس کے لیے۔

کلائیو : ہم پورا اٹیس لاکھ دے گا۔

اومی چند : لکھ کر دیجیے۔

کلائیو : یہ بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ڈیکھو میر جعفر سے یہ کہا کہ ہم سراج الدولہ کو ہٹا کر اسے بنگال کا نواب بنانا مانگتا ہے۔

(رات کا وقت)

آمنہ : سراج بیٹا! آج رات تو پھر باغ کی روش پر ٹہل رہا ہے۔ کیا پھر کسی نے تیرا ہاتھ کھینچا ہے؟

سراج الدولہ : نہیں اماں کسی نے میرا ہاتھ نہیں کھینچا، مگر بہت سے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔

آمنہ : کیسے ہاتھ بیٹا؟

سراج الدولہ : یہ وہ ہاتھ ہیں اماں! جن کی آستینوں میں خنجر چھپے ہیں یہ ہاتھ اپنے سارے خنجر میری پیٹھ میں گھونپ دینا چاہتے ہیں۔

آمنہ : سراج تو آج کیسی باتیں کرنے لگا ہے؟

سراج الدولہ : اماں! میں کیا کروں میرے چاروں طرف سازش کی دُھول رہی ہے یہ سازشی کہیں باہر سے نہیں آئے، یہیں پیدا ہوئے ہیں یہیں انہوں نے پرورش پائی ہے۔ میرے خاندان ہی کا نمک کھا کر جوان ہوتے ہیں لیکن آج

لالچ نے اُن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔

آمنہ : بیٹا! مَیں پوچھتی ہوں یہ لوگ کون ہیں؟

سراج الدولہ : وہ لوگ جن کا خمیر اس ملک کی خاک سے اُٹھایا گیا ہے جن کے ننگ وناموس کو آج وہ اپنے پاؤں تلے روندنے کی ناپاک کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ، یہ وطن کے غدار ایک اجنبی طاقت سے ساز باز کر رہے ہیں۔ انہی لوگوں کی سازش کا نتیجہ ہے کہ آج یہ سات سمندر پار سے آیا ہوا لارڈ کلائیو مجھے دھمکی دے رہا ہے کہ اگر مَیں نے فرانسیسیوں سے تعلقات نہ توڑے تو انجام بہت بُرا ہوگا۔

آمنہ : بیٹا تُو ان غداروں کا صفایا کیوں نہیں کر دیتا؟

سراج الدولہ : اماں! بظاہر سب کے سب میرے ساتھ ہیں۔

آمنہ : تیری فوج کا ہر سپاہی تیرے ساتھ ہے۔ ہر سپاہی تیرے لیے کٹ مریگا۔

سراج الدولہ : اماں یہی طاقت ایک ایسا چراغ ہے جسے کسی اجنبی آندھی کے تھپیڑوں کا خوف نہیں ہے۔ یہ چراغ طوفانوں میں بھی جلتا رہے گا مگر مَیں کیا کروں۔ میرے اپنے آدمی اپنی پھونکوں سے اسے بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مَیں اُن سے جنگ کروں گا۔

آمنہ : انشاءاللہ فتح تیری ہوگی۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے میرے بیٹے! یہ چراغ ہمیشہ جلتا رہے گا۔

(جنگ کا ہنگامہ)

سراج الدولہ : (گرج کر) جعفر! تم نے فوجیں کیوں ہٹالی ہیں؟

میر جعفر : آپ دیکھ نہیں رہے انگریزوں کی فوج چاروں طرف پھیل گئی ہے۔ مصلحت اسی میں ہے کہ جنگ بند کر دی جائے۔

سراج الدولہ : جعفر! یہ کیا کہہ رہا ہے تُو ہمارے پاس تو پچاس ہزار سپاہیوں کی فوج ہے۔

میر جعفر: میں کچھ نہیں کر سکتا۔

سراج الدولہ: (گرج کر) جعفر! ہم تجھے حکم دیتے ہیں، دشمن پر حملہ کرو۔

میر جعفر: میں مجبور ہوں۔

سراج الدولہ: جعفر!

میر جعفر: مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا ہوں۔

سراج الدولہ: تو دفع ہو جا، ہم خود حملہ کریں گے۔

میر جعفر: سپہ سالار میں ہوں سپاہی میرا حکم مانیں گے۔

سراج الدولہ: جعفر (نرمی سے) جعفر! دیکھو! یہ ہماری تاریخ کا بے حد نازک وقت ہے اگر تم نے آج اس میدان میں ان لٹیروں کو نہ روکا تو پھر یہ کہیں بھی نہیں رکیں گے۔ برابر آگے بڑھتے چلے جائیں گے اور ایک ایسا منحوس دن بھی آ جائیگا جب یہ سارے ملک پر چھا جائیں گے۔ تو ہم سے دشمنی کرنی چاہتا ہے تو ہم تجھے نہیں روکیں گے، مگر وطن کی پکار سُن، وطن تجھے پکار رہا ہے۔ کیا تو وطن کی پکار نہیں سنے گا۔ کیا تیرے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ کیا لالچ نے تیرے احساس کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں؛ جعفر! جعفر!

میر مدن: حضور! آپ نے اس پر بھروسہ کیا، حالانکہ وطن کا سب سے بڑا غدار یہ ہے۔ اس کی طرف مت دیکھیے۔ ہم لڑیں گے اور آخری سانس تک لڑیں گے۔

(جنگ بہت تیز ہو جاتی ہے)

میر مدن: اوہ میرے اللہ!

سراج الدولہ: میر مدن!

میر مدن: میرے حضور شکر ہے میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اللہ کا احسان ہے کہ مجھے شہیدِ وطن ہونے کا فخر حاصل ہوا۔

سراج الدولہ: میر مدن: اس اندھیرے میں تم ہی ایک شعلہ تھے۔

میر مدن: خدا حافظ میرے حضور! آپ یہاں سے چلے جائیے، غدار

الگ ہو گئے ہیں۔ جاں نثار جانیں قربان کر رہے ہیں۔ بہت کم سپاہی باقی رہ گئے ہیں۔
آپ چلے جائیں حضور چلے جائیں۔ خدا حافظ۔

(گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے)
(منظر بدلتا ہے)

لیلیٰ : بانو حضور! آپ یہ شور سن رہی ہیں؟

آمینہ : یہ کیسا شور ہے لیلیٰ!

لیلیٰ : بانو۔ حضور۔ وہ۔

آمینہ : میرے بیٹے کے ساتھ کیا ہوا ہے مجھے کوئی خبر نہیں ملی۔ (لیلیٰ کی سسکیاں)

لیلیٰ : وہ۔ نواب صاحب، ہاتھی کے ہودے میں ہیں اور ہاتھی ادھر آ رہا ہے۔

آمینہ : میرا بیٹا ہاتھی کے ہودے میں ہے؟

لیلیٰ : مگر!

آمینہ : میرا بیٹا آ رہا ہے ہاتھی کے ہودے میں بیٹھ کر۔

لیلیٰ : بانو! (لیلیٰ زور زور سے رونے لگتی ہے) وہاں اُن کی لاش ہے
بانو حضور! نواب سراج الدولہ کی لاش۔ آپ کے بیٹے کی لاش۔

آمینہ : کیا کہا؟

لیلیٰ : وہ شہید ہو چکے ہیں۔

آمینہ : میرا بیٹا شہید ہو گیا ہے۔ میرا لختِ جگر، میری آنکھوں کا نور، میرا سراج الدولہ
(شور بالکل قریب آ گیا ہے۔)

آمینہ : میں خود باہر جاؤں گی اور اپنے لال کو اپنے بازوؤں پر بٹھا کر اندر لاؤں گی۔

لیلیٰ : بانو! خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے۔

آمینہ : میں ماں ہوں جان اپنے لختِ جگر کو گود میں نہیں اٹھائے گی تو اور کون اٹھائیگا؟
(وقفہ) رُک لو ہاتھی! آمیرے شہید بیٹے! میری گود میں۔ آج کتنی رونق ہے تیرے چہرے پر کس طرح چمک
رہا ہے اور یہ تیرا سُرخ لباس تو نے کہا تھا! اماں! ہو سکتا ہے تو میرا لباس میرے اپنے ہی لہو سے
سُرخ دیکھے اور آج تو سُرخ لباس پہن کر آ گیا ہے میرے سراج! میرے بیٹے! آج میں تیری پیشانی
کو آخری بار بوسہ دوں گی، میرے شہید بیٹے۔ میرے۔ ش۔ ہید بیٹے۔

سیّد احمد شہیدؒ

کردار :-

سیّد احمد شہید ——— بہرام خاں

حسن علی ——— غلام رسول

شمشیر علی ———

کچھ اور لوگ

(دروازے پر دستک)

بہرام خاں : کون ہے؟

حسن علی : بہرام خاں! میں ہوں حسن علی، دروازہ کھول دو۔

بہرام خاں : اکیلے ہو؟

حسن علی : اکیلا ہوں بے فکر ہو کر دروازہ کھولو۔ (ذرا سا وقفہ)

بہرام! اس قدر خوفزدہ کیوں ہو؟

بہرام خاں : حسن علی! یہ بات مجھ سے پوچھ رہے ہو! تمہیں خبر نہیں کہ میرے اور اس سرزمین کے سارے لوگوں کے خوفزدہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

حسن علی : کوئی نیا واقعہ؟

بہرام خاں : ایک واقعہ ہو تو بیان بھی کر دوں۔ اِدھر آؤ کھڑکی کے پاس۔

حسن علی : وہاں کیا ہے؟

بہرام خاں : وہ دیکھ رہے ہو دھواں؟

حسن علی : لگتا ہے وہاں کسی مکان کو آگ لگی ہے

بہرام خاں : مکان جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ اگر تم سرِشام یہاں آتے تو آسمان تک بلند ہونے والے شعلے دیکھتے۔ حسن علی اِن شعلوں نے ایک پورے خاندان کا سارا سرمایہ خاک میں ملا دیا ہے۔ وہ بدنصیب لوگ جو اِس مکان میں رہتے تھے، نومبر کی اِس سردی میں نہ جانے کہاں کہاں سر چھپانے کے لیے ٹھکانا ڈھونڈ رہے ہیں۔

حسن علی : یہ گھر کس کا تھا؟

بہرام خاں : میری بہن کا !

حسن علی : تمہاری بہن کا؟

بہرام خاں : حسن علی! میں چاہتا ہوں کہ چارسدہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں۔

حسن علی : کہاں جانا چاہتے ہو؟

بہرام خاں : خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ میں کسی ایسے مقام پر چلا جاؤں گا، جہاں امن و امان ہو، جہاں لوٹ مار نہ ہو، جہاں لٹیرے غریب لوگوں کو تباہ و برباد کرنے پر تُلے ہوں! میں نے اپنے دل سے عہد کر لیا ہے کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا!

حسن علی : بہرام خاں!

بہرام خاں : کیوں حسن علی!

حسن علی : تم یہیں رہو گے۔ تم کہیں بھی نہیں جاؤ گے!

بہرام خاں : تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟

حسن علی : میں تمہیں نہیں روک سکتا۔ کوئی بھی کسی کو نہیں روک سکتا!

بہرام خاں : پھر ایسی بات کیوں کہتے ہو؟

حسن علی : یاد ہے چند روز پہلے جب اسلام کے دشمنوں نے ایک مسجد کو آگ لگا دی تھی تو تم نے کہا تھا کہ اب کوئی فرشتہ ہی نازل ہوگا جو ہمیں ان غارت گروں سے بچائے گا۔

بہرام خاں : میں نے کہا تھا۔

حسن علی : وہ رحمت کا فرشتہ چارسدہ میں آ چکا ہے۔

بہرام خاں : کون؟

حسن علی : میرے ساتھ چلو!

بہرام خاں : چلو۔

حسن علی : آج تمہیں معلوم ہوگا کہ ایک انسان کی آواز بجلی کی کڑک اور بادل کی

گرج کس طرح بن سکتی ہے۔ آج تم اپنے کانوں سے وہ آواز سنو گے جس میں طوفان کا سا جوش و خروش ہے۔ آج تم وہ صورت دیکھو گے جس سے دوپہر کے سورج کا جلال ہویدا ہے وہ گرجتا ہے تو سینوں کے اندر دل کانپ کانپ جاتے ہیں۔ وہ للکارتا ہے تو روشنی کی ایک لہر ہر طرف پھیل جاتی ہے۔

بہرام خان: یہ تم کیا کہہ رہے ہو حسن علی!

حسن علی: یہ شخص ہماری بکھری ہوئی قوتوں کی شیرازہ بندی کرے گا۔ یہ شخص بزدلوں کے اندر بہادری کی رُوح بیدار کرے گا!

بہرام خان: خدا کے لیے مجھے بتاؤ یہ شخص کہاں ہے؟

حسن علی: چارسدہ کی ایک مسجد میں۔

بہرام خان: اب میں ایک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔

حسن علی: مَیں نے اسی مقصد کے لیے آدھی رات کے وقت تمہارے دروازے پر دستک دی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔

(موسیقی جو چند لمحے جاری رہتی ہے اس کے بعد سید احمد کی گرجتی ہوئی آواز بلند ہوتی ہے)

سید احمدؒ: بھائیو! میں دُور دراز کا سفر طے کر کے یہاں آیا ہوں کہ خدا کے بندوں کو خدا کے باغیوں سے نجات دلاؤں۔ یہاں آیا ہوں کہ اُن لوگوں کے خلاف جہاد کروں جنہوں نے معصوم انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے۔ مجھے کوئی لالچ نہیں ہے۔ مجھے اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضامندی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ یہ سرزمین دارالحرب بن چکی ہے۔ امن و امان غارت ہو چکا ہے۔ زندگی زندگی کی نعمتوں سے محروم ہو گئی ہے۔ ظالموں نے میانوں سے ظلم و ستم کی تلواریں نکال لی ہیں اور مظلوموں کا لہو انتہائی بے دردی کے ساتھ بہایا جا رہا ہے۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے سفید فام تاجروں نے ہمارے ملک پر

قبضہ کرلیا ہے۔ ہمارے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں ڈال دی ہیں اور مرکزی قوت پارہ پارہ ہوچکی ہے۔ ہمیں ان کافروں کے خلاف جہاد کرنا ہے اور ہمیں اُن سکھوں کے خلاف بھی جہاد کرنا ہے جو رات دن اس سرزمین کو پامال کر رہے ہیں۔ دوستو! نکل آؤ اپنے گھروں سے ظلم کی آندھی روکنے کے لیے۔ غلامی کی زنجیریں پاش پاش کرنے کے لیے۔ اسلامی شان وشوکت کا پرچم ان بلندیوں پر لہرانے کے لیے۔ آج جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ آج جہاد کرنا اللہ کا حکم ہے۔ آج جہاد کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔ آج ایک اور صرف ایک آواز ہمارے دلوں میں گونجنی چاہیے۔ (بڑے جوش کے عالم میں)

برخیز کہ شورِ کفر برخاست!

(مجمعے سے ایک دم بہت سی آوازیں ابھرتی ہیں)

برخیز کہ شورِ کفر برخاست

اعلان کردو کہ سروں سے کفن باندھ کر میدان میں کودنے کا وقت آگیا ہے۔ گھر گھر جاکر بتادو کہ ہندوستان کو کفر کی آلودگیوں سے پاک کرنے کا وقت آپہنچا ہے۔

ہر شخص سے کہہ دو کہ یہ وقت جہاد کا ہے آج سب کے سب جہاد کے لیے تیار ہو کر آجاؤ۔

(آوازیں آتی ہیں لبیک۔ لبیک۔ لبیک۔ لبیک اور جب لبیک لبیک کہتی ہوئی آوازیں تھم جاتی ہیں تو سید احمد کی آواز آتی ہے)

آؤ بھائیو! اللہ کی بارگاہ میں دعا کریں۔

اے پروردگار! تو بڑا قادر ہے بے نیاز ہے۔ ہم سب تیرے بندے محتاج و ناچار ہیں۔ سوا تیرے کوئی ہمارا حامی و مددگار نہیں۔ ہم سب تیری ہی رضامندی کے لیے اپنی جانیں قربان کردیں گے۔ اے پروردگار ہمیں جہاد کی توفیق دے۔ ہمیں کافروں سے لڑنے کی توفیق دے۔ ہمیں کفر کا مقابلہ کرنے کی توفیق دے۔

(آمین آمین کا ہنگامہ۔ چند لمحوں کے بعد یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے)

بہرام خاں: السلام علیکم یا سید!

سید احمد: وعلیکم السلام آئیے تشریف رکھئے!

حسن علی: یا سید! کافروں نے اس بیچارے کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا گھر لوٹا گیا ہے اور رات اس کی بہن کا مکان جلا دیا گیا ہے۔

سید احمد: انا اللہ مع الصابرین۔ صبر کیجئے اور حق سبحانہٗ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوئیے!

بہرام خاں: یا سید! میں سچ کہتا ہوں دشمنوں کی ستم گری سے میں اس قدر ہراساں اور پریشان ہو گیا تھا کہ اگر اس وقت حسن علی مجھے آپ کی خدمت میں نہ لاتے اور میں آپ کے الفاظ نہ سنتا تو اب تک رختِ سفر باندھ چکا ہوتا۔ میرا ارادہ صبح سویرے یہاں سے رخصت ہو جانے کا تھا۔

سید احمد: میرے بھائی اس وقت ہندوستان دارالحرب بن چکا ہے۔ ایسے موقع پر اپنے بھائیوں، بہنوں، اعزہ واقارب کو دشمنوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر اپنی جان بچانا مناسب نہیں ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ! دانا بینا ہیں۔

بہرام خاں: بھول ہو گئی تھی۔

سید احمد: اب کیا ارادہ ہے میرے بھائی؟

بہرام خاں: آپ نے میرے دل و دماغ کی دنیا ہی بدل ڈالی ہے۔

سید احمد: بھائی میرے۔ اس فقیر پُرتقصیر میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ یہ تمہاری اپنی قوت ایمانی ہے جس نے تمہیں اپنا پہلا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔

بہرام خاں: آپ کی آواز میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی ہے۔

سید احمد: یہ میرے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالعزیز کے فیضانِ صحبت کا نتیجہ ہے۔ میں ایک بے حد معمولی انسان تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور میرے اندر ایمان کا چراغ روشن کر دیا۔ اللہ نے مجھے توفیق دی کہ کفر کا

مقابلہ کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑو اور میں نکل پڑا۔ راستہ بہت طویل، بڑا پیچیدہ اور پُر خار ہے۔ میرے سچّے آقا نے کرم کیا اور وہ ضرور کرم کرے گا۔ تو میرے قدم کہیں بھی نہیں رکیں گے۔

بہرام خاں: یا حضرت! میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس ایمان افروز سفر میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔

سیّد احمد: مرحبا!

حسن علی: میرا بھی یہی ارادہ ہے۔

سیّد احمد: اللہ آپ کو اپنے ارادے میں استقامت بخشے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے پاس مجاہدوں کی ایک پوری فوج ہونی چاہیے انگریز غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کر رہے ہیں اور ادھر دوسرے کافروں نے بہت فتور مچا رکھا ہے۔ میں جب رائے بریلی میں تھا تو ان فتنہ گروں کی بد عنوانیوں کے قصّے ہر روز سُنا کرتا تھا اور میرا خون کھولتا رہتا تھا۔ ایک روز میں نے دیوانِ حافظ سے فال نکالی تو یہ شعر آنکھوں کے سامنے آگیا۔

تیغ تو آسمانش از فیضِ خود دہد آب
تنہا جہاں بگیرد بے منّتِ سپاہی

میں نے سمجھ لیا کہ اللہ کا فرمان یہ ہے کہ میں جہاد کے لیے روانہ ہو جاؤں۔ اور میں نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر روانہ ہونے کا عزم کر لیا۔

حسن علی: اہلِ سرحد کافروں کی غارت گری سے بیحد پریشان ہیں۔

سیّد احمد: سرحد کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک، ہر جگہ، ہر مقام، ہر شہر، ہر گلی، ہر مکان میں یہ پیغام پہنچا دو۔

"برخیز کہ شورِ کفر برخاست"

(سیّد احمد کی اس آواز کے اختتام پر حسن علی اور بہرام خاں یہی مصرع بیک زبان دہراتے ہیں اور اسی لمحے مسجد سے اذان کی

آواز بلند ہوتی ہے) (وقفہ)

سیّد احمد: غلام رسول!

غلام رسول: جی جناب!

سیّد احمد: تم نے نماز سے پہلے کسی مشتبہ شخص کا ذکر کیا تھا۔

غلام رسول: یہ وہ شخص ہے جناب!

سیّد احمد: تم جاؤ۔ اور تھوڑی دیر بعد جب آؤ تو حسن علی اور بہرام خاں کو بھی ساتھ لیتے آنا۔

غلام رسول: بہتر حضور!

سیّد احمد: تمہارا نام کیا ہے؟

شمشیر علی: شمشیر علی!

سیّد احمد: تمہیں تو علی کی شمشیر بننا چاہیے تھا مگر تم ——

شمشیر علی: آپ کے خادموں نے مجھ پر زیادتی کی ہے کہ مجھے پکڑ لائے ہیں۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔

سیّد احمد: (غصے سے) شمشیر علی! تم نے بیک وقت دو جھوٹ بولے ہیں۔ تم جن لوگوں کو میرے خادم کہہ رہے ہو وہ میرے بھائی ہیں۔ مجھ سے زیادہ معزز اور محترم ہیں اور تمہارا دوسرا جھوٹ یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو بے قصور کہتے ہو۔ حالانکہ تم دشمنوں کے جاسوس ہو۔ جانتے ہو دشمن کے جاسوس کی سزا کیا ہے؟

شمشیر علی: میں نہیں جانتا۔

سیّد احمد: دشمن کے جاسوس کو قتل کیا جاتا ہے۔ تمہیں یہی سزا ملنی چاہیے۔ مگر پہلے ایک سوال کا جواب دو۔

شمشیر علی: کس سوال کا جواب آپ مانگتے ہیں؟

سیّد احمد: شمشیر علی! اگر تمہارے گھر کو آگ لگا دی جائے تو کیا تم شعلوں پر تیل ڈالو گے؟

شمشیر علی : ہرگز نہیں۔

سید احمد : یہ ملک، جو تمہارا وطن ہے دشمن اس کو آگ لگا چکے ہیں اور تم ان دشمنوں کی مدد کر رہے ہو۔ اگر تم میں ایمان کا ایک ذرہ بھی موجود ہے تو صاف صاف بتاؤ کہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تم اپنے بھائیوں کی پشت میں زہر بھرا خنجر نہیں بھونک رہے ہو؟ کیا دولت کے لالچ نے تمہاری آنکھوں کو اندھا نہیں کر دیا؟ کیا تم اپنی حرکت سے کفر کے سیلاب کے لیے راستہ نہیں صاف کر رہے؟ بتاؤ تمہارا کیا جواب ہے۔

شمشیر علی! خاموش کیوں ہو؟

شمشیر علی : میں نے اپنی گردن جھکا دی ہے۔ تلوار آپ کے ہاتھ میں ہے۔

سیّد احمد : تم اپنے کیے پر نادم ہو؟

شمشیر علی : سخت نادم ہوں۔

سیّد احمد : شمشیر علی! یہ تلوار تمہاری گردن کے لیے نہیں ہے۔ تمہارے ہاتھوں کے لیے ہے۔ اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور مجاہدوں کی صف میں شامل ہو جاؤ جو کفر کے سیلاب کے آگے لوہے کی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے ہیں کیا اس کیلئے تیار ہو؟

شمشیر علی : بسر و چشم۔

سیّد احمد : تلوار اٹھا لو۔

شمشیر علی : یا حضرت! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے یہ تلوار بدھ سنگھ کی فوجوں پر چمکے گی۔

سیّد احمد : انشاء اللہ۔

غلام رسول : کھانا لے آیا ہوں۔

سیّد احمد : حسن علی اور بہرام خاں بھی آگئے ہیں؟

بہرام خاں : جی حضرت۔

سیّد احمد : یہی زمین ہمارا دستر خوان ہے۔ تینوں بھائی بیٹھ کر کھانا کھا لو۔

حسن علی : اور آپ۔

سیّد احمد: آج تم تینوں ہمارے مہمان ہو۔ مہمان کا حق میزبان کے حق پر فوقیت رکھتا ہے۔

غلام رسول: آپ کے لیے میں کھانا لے آؤں؟

سیّد احمد: نہیں غلام رسول! کوئی نہ کوئی مجاہد بھوکا رہ جائے گا۔ جاؤ تم اُن بھائیوں کو کھانا کھلاؤ۔

غلام رسول: جیسا حکم۔

سیّد احمد: میرے عزیز بھائیو! ہمارے یہاں صرف روٹیوں اور پیاز کا انتظام ہو سکتا ہے۔ مجھے شرمندگی ہے کہ ہمارے مہمانوں کو یہ نہایت معمولی کھانا پسند نہیں آئے گا۔

شمشیر علی: حضور! میں سچ عرض کرتا ہوں یہ کھانا کافروں کی دی ہوئی نعمتوں سے ہزار گُنا بہتر ہے کیونکہ اس سے میرا ضمیر زندہ رہے گا۔ اُن نعمتوں کو کھا کر تو میری رُوح مُردہ ہو چکی تھی اور میری ایمانی قوت بالکل کمزور پڑ چکی تھی۔

سیّد احمد: خدا تمہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔

(گزرانِ وقت کے لیے موسیقی)

بہرام: یا امیر! آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے۔

سیّد احمد: بھائی بہرام! ہم نے سرحد کے سرداروں اور قبیلوں کے سربراہوں کے نام جو خط لکھوائے تھے وہ انھیں بھیج دیے گئے ہیں؟

بہرام خاں: ہم ایک ایک سردار کے پاس گئے تھے اور اسے آپ کا مکتوب گرامی پڑھ کر سُنا دیا تھا۔

سیّد احمد: اُن لوگوں کی رائے کیا ہے؟

بہرام خاں: حضور! میں سچ عرض کرتا ہوں کہ جب بھی کوئی سردار آپ کے الفاظ سُنتا تھا تو جوشِ ایمانی سے اس کا رنگ سُرخ ہو جاتا تھا۔

سیّد احمد: سب جہاد کے لیے تیار ہیں؟

بہرام خاں: سرحد میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بے پناہ جوش وخروش پھیل گیا ہے۔

سید احمد: الحمد للہ۔

بہرام خاں: ہزاروں لوگ مسجد اور مسجد کے باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ سب آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے لیے آئے ہیں۔

(دُور سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوتا ہے)

سید احمد: بہرام خاں!

بہرام خاں: حضور! ذرا رُک جائیے آپ نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔ خدانخواستہ کمزور نہ ہو جائیں۔

سید احمد: میں رُک نہیں سکتا بہرام خاں! اللہ کے بندے مجھے بُلا رہے ہیں اور میں یہاں بیٹھ کر کھانا کھانے لگوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا!

بہرام خاں: پھر بھی یا امیر

سید احمد: فریضہ بیعت ادا کرنے کے بعد موقع ملا تو کھالوں گا (اللہ اکبر کے نعروں کی آواز بتدریج بلند ہوتی جاتی ہے)

میرے عزیز اور محترم بھائیو! السلام علیکم۔ (وعلیکم السلام کا ہنگامہ) تمہارا یہ جوشِ ایمانی دیکھ کر مجھے فتح ونصرت کا یقین کامل ہو گیا ہے۔ بھائیو! تم کیا چاہتے ہو؟

(سب کی آواز "شہادت چاہتے ہیں")

سید احمد: شہادت ہر مجاہد کا نصب العین ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ سروں پر کفن باندھ کر آگئے ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے چہرے جوشِ ایمانی سے سُرخ ہو گئے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جذبۂ جہاد سے تمہارے سینے معمور ہیں۔ کافروں سے کہہ دو کہ اپنی ذلت انگیز شکست کے لیے تیار ہو جائیں، کیونکہ اللہ کے بندوں کی تلواریں میانوں سے نکل آئی ہیں۔ اسلام کے دشمنوں میں اعلان کر دو کہ غازی

ایک سیلِ بے پناہ کی طرح بڑھنے والے ہیں، جس کی روانی میں ان کا حقیر و بے مایہ وجود تنکے کی طرح بہہ جائے گا۔ ہم آگے بڑھیں گے اور بڑھتے جائیں گے۔ اللہ اکبر۔

(سب اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہیں)

(وقفہ)

حسن علی: شمشیر علی! رات کتنی باقی ہے؟

شمشیر علی: آدھی رات گزر گئی ہے۔

حسن علی: اب حضور کی طبیعت کیسی ہے؟

شمشیر علی: غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ ذرا ہوش میں آتے ہیں تو پھر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

حسن علی: یہ معاملہ کیا ہے۔ نوشہرہ کی فتح کے بعد اُن کی بیماری تشویشناک ہو گئی ہے۔

بہرام خاں: غلام رسول! تم جانتے نہیں تھے کہ یار محمد خاں کی زبان ہمارے ساتھ ہے۔ مگر دل نہیں ہے۔ وہ غدار ہے۔

حسن علی: تم کہنا کیا چاہتے ہو؟

بہرام خاں: تم غدار سے کیا توقع رکھ سکتے ہو۔ لوگوں کا جوشِ ایمانی دیکھ کر مصلحتاً اُس نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ اصل میں وہ سکھوں کا ساتھی ہے۔ بدھ سنگھ سے اس کے تعلقات بڑے مضبوط ہیں۔ میں اگر اس وقت موجود ہوتا جب یار محمد خاں کے گھر سے کھچڑی آئی تھی تو سید صاحب کو ایک لقمہ بھی کھانے نہ دیتا۔

(سید احمد کی آواز آتی ہے)

سید احمد: بہرام خاں۔

بہرام خاں: یا امیر حضور! اب طبیعت کیسی ہے؟

سید احمد: اللہ کا شکر ہے۔ طبیعت بہت حد تک سنبھل گئی ہے، البتہ کمزوری ہے۔

حسن علی: حضور! آپ بیٹھیے نہیں۔ لیٹے رہیے۔

سید احمد : حسن علی میرے بھائی اگر میری موت کا وقت آپہنچا ہے تو مجھے تلوار ہاتھ میں لے کر میدانِ جنگ میں جانا چاہیے۔ مجھے یہ موت قبول نہیں ہے میں اُس وقت اپنی جان اپنے پیدا کرنے والے کے سپرد کروں گا۔ جب میرے جسم کے ہر زخم سے لہو بہہ رہا ہوگا اور میں دشمن کی صفیں چیر کر موت تک پہنچ جاؤں گا۔

حسن علی : مگر امیر ملت آپ کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔

سید احمد : یہ بالکل عارضی کیفیت ہے۔

بہرام خاں : میں اور غلام رسول آپ کو سہارا دیتے ہیں۔

سید احمد : نہیں بہرام خاں میں میدانِ جنگ میں کسی کے سہارے نہیں جاؤں گا۔ اپنے پیروں پر جاؤں گا۔ حسن علی!

حسن علی : جی حضرت!

سید احمد : حکیم مومن خاں مومنؔ نے جو مثنوی برائے جہاد لکھی ہے۔ اُس کے کچھ شعر سُناؤ۔

حسن علی : حضرت! ہمارے ایک مجاہد کی آواز بڑی پُر جوش اور مترنم ہے۔ اگر ارشاد فرمائیں تو اُن سے کہوں؟

سید احمد : وہ مجاہد یہیں کہیں ہے؟

حسن علی : جی ہاں۔

سید احمد : بلاؤ اُسے۔

(ذرا سا وقفہ۔ پھر مجاہد کی مترنم آواز بلند ہوتی ہے)

ایک مجاہد۔

پلا مجھ کو ساقی شرابِ طہور ۔۔۔ کہ اعضا شکن ہے خمارِ فجور
کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا ۔۔۔ کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
بر رنگ مے ایماں کو آجائے جوش ۔۔۔ نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش
عنادِ نہفتہ کو ظاہر کروں ۔۔۔ دمِ تیغ سے قتلِ کافر کروں

دکھادوں بس انجام الحاد کا ۔۔۔ نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار ۔۔۔ پہ تیرے کرم کا ہوں اُمیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے ۔۔۔ عروجِ شہید اور صدیق دے

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل ہے افضل عبادت نصیب

سید احمد:۔۔۔ الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل ہے افضل عبادت نصیب

(لڑائی کا ہنگامہ جو کئی لمحے جاری رہتا ہے)

بہرام خاں: حضور! وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا یار محمد خاں اپنا لشکر لے کر الگ ہو گیا ہے۔

سید احمد: کوئی بات نہیں۔

بہرام خاں: حضور دیکھئے وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ بھاگ رہا ہے اور بلند آواز سے "شکست" کہتا جا رہا ہے۔

(جنگ کا ہنگامہ مدھم ہو کر غمناک موسیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے)

سید احمد: (آواز میں درد) شکست! نہیں۔ ہمیں شکست نہیں ہوئی۔ ایک غدار کی وجہ سے ہمیں سخت نقصان ہوا ہے۔ ہمارے چھ ہزار مجاہد شہید ہو کر میدان جنگ کو اپنے مقدس خون سے لالہ زار کر گئے ہیں۔ اگر یہ غدار ہمارے ساتھ دھوکا نہ کرتا تو بدھ سنگھ کی مجال نہیں تھی کہ ہمارا جم کا مقابلہ کرتا۔ خیر اللہ کو یہی منظور تھا، مگر میرے عزیز بھائیو یہ مت سمجھو کہ ہمیں شکست ہوتی ہے ہرگز نہیں، ہرگز نہیں! ہمارا ایمانی جوش سلامت ہے۔ ہمارے بازو سلامت ہیں۔ ہماری تلواریں سلامت ہیں۔ آخری فتح ہماری ہو گی۔

(دوران موسیقی میں جنگ کا ہنگامہ جو پس منظر میں رہتا ہے، اس ہنگامے میں سے سید احمد کی گرجدار آوازیں واضح طور پر کہتی ہیں)

شاباش اللہ کے شیرو!

مرحبا غازیو!

بڑھتے چلو مجاہدو: "برخیز کہ شورِ کفر برخاست" یہ آوازیں رُک جاتی ہیں،
موسیقی مدھم پڑ جاتی ہے)

سید احمد: ہم بالاکوٹ میں آپہنچے ہیں بہرام خاں؟

بہرام خاں: جی حضور!

سید احمد: اس کوہستانی زمین سے مجھے عجیب قسم کی خوشبو آرہی ہے۔
ایسی خوشبو جس سے میری رگ رگ میں سرور پیدا ہو گیا ہے۔ ایسی نسیم جانفزا میرے
بدن کو چھو رہی ہے کہ لگتا ہے جنت کا کوئی دریچہ یک دم کھل گیا ہے۔ آنکھوں کے
سامنے نور کا ایک سیلِ رواں موجزن ہے۔ دل و دماغ میں ایک والہانہ مسرت کی لہریں
اٹھ رہی ہیں۔ بالاکوٹ تیرے ذرّے ذرّے کو میرا سلام پہنچے۔ بہرام خان اس وقت
بے اختیار نظیری کا ایک شعر یاد آگیا ہے۔

پائم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

یہ جلوہ گاہ ہے حُسنِ ازل کی۔ میرا دل کہتا ہے یہ مقام کُفر و اسلام کی ایک تاریخی
رزمگاہ بنے گی۔ غازیوں کے مقدس خون سے اس زمین کا چہرہ نکھر جائے گا۔ یہاں
میری تمنا پوری ہوگی۔ کہو شمشیر علی کیا خبر لائے ہو؟

شمشیر علی: یا حضرت! سردار نجف کا پیغام آیا ہے۔

سید احمد: کیا کہا ہے اُنہوں نے؟

شمشیر علی: انہوں نے کہا ہے کہ سکھوں کی فوج مظفر آباد میں جنگ کرنے کی
بجائے بالاکوٹ کی طرف آرہی ہے۔ شیر سنگھ کی اس فوج میں بارہ ہزار بندوقچی ہیں۔

سید احمد: یہ تعداد ہمارے مجاہدوں سے قریباً دس گُنا زیادہ ہے۔

شمشیر علی: جی ہاں! سردار نجف خان نے کہا ہے کہ آپ پیچھے پہاڑ پر چلے
جائیں، سکھوں کی فوج واپس چلی جائے گی۔

سید احمد: سردار نجف خاں مجھے یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ میں کفر کی یلغار سے خوفزدہ ہو کر گوشۂ عافیت اختیار کر لوں؟

شمشیر علی: انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ رات کے اندھیرے میں دریا کے مشرقی کنارے پر پہنچ جائیں اور دشمن پر شبخون ماریں۔

سید احمد: مشہد بالاکوٹ سے الگ ہونا ہماری دلی آرزو کے خلاف ہے۔ ہم کفار کے ساتھ یہیں لڑیں گے۔ میرے دل کی پکار ہے کہ اللہ کی رضامندی اسی جگہ جنگ کرنے میں ہے اور اللہ کی رضامندی کے سامنے دنیا و مافیہا کی حقیقت ہی کیا ہے؟ سردار نجف خاں کو میری طرف سے یہ پیغام پہنچا دو کہ سید احمد اس مقام سے لڑے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے گا۔ ہم فاتح ہو کر یہاں سے لاہور کا رُخ کریں گے یا اسی جگہ اپنا آخری قطرہ خون بھی بہا دیں گے۔

بہرام خاں: سردار حبیب اللہ خاں مسجد بالا میں ہیں۔ انہوں نے آپ سے مخاطب ہو کر کچھ نہیں کہا تھا؟

سید احمد: میں نے اُن کی بات سُن لی تھی بہرام خان! وہ کہہ رہے تھے کہ کفار کا لشکر تعداد میں ہم سے بہت زیادہ ہے اور ان کے جنگ کا ساز و سامان بھی ہم سے زیادہ ہے۔

بہرام خاں: یہی بات انہوں نے کہی تھی۔

سید احمد: دشمن کا لشکر جرّار اور اس کا ساز و سامان ہمیں کسی صورت بھی مرعوب نہیں کر سکتا۔ فتح و شکست اس مالکِ حقیقی کے ہاتھ میں ہے۔ جو کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ چاہے تو اسلام کی مختصر سی فوج کو کافروں کے بڑے سے بڑے لشکر پر فتح یاب کر دے۔ ہماری تاریخ ایسی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جن میں گنتی کے چند مجاہدوں نے کافروں کی بڑی فوجوں کو ذِلت انگیز شکست دی ہے۔ ہمیں صرف اللہ کی رضا درکار ہے۔ ہم اِس کے لیے جیتے ہیں اور اِس کے لیے مرتے ہیں۔ بہرام خاں! ہمارے سارے سرداروں کو اطلاع کر دو

کہ مسجد بالاکوٹ کے پاس جمع ہو جائیں۔

(گزران وقت کے لیے موسیقی)

سید احمد: اللہ کے بہادر سپاہیو! آج بالاکوٹ کی اس پتھریلی زمین پر ہمارا اور کافروں کا فیصلہ کن تصادم ہوگا۔ اس جنگ کے بعد ہم اسلام کی شوکت و فتح یابی کا پرچم لہراتے ہوئے لاہور جائیں گے اور وہاں کی زمین کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر روشنیوں میں لے آئیں گے۔ یہ جنگ ہمیں بڑی بہادری اور تنظیم کے ساتھ لڑنا ہوگی۔ میرے بھائیو! آپ سب مورچوں میں ڈٹ کر بیٹھ جائیں اور ان مورچوں سے کافروں پر گولیوں کی بوچھاڑ کریں اور اس وقت باہر آئیں جب ہمارا نشان آپ کو آگے بڑھتا ہوا نظر آئے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو!

(تیز موسیقی اور اس کے ساتھ ہی فائرنگ کا ہنگامہ)

سید احمد: بہرام خاں! اب وقت آگیا ہے کہ میں نشان لے کر آگے بڑھوں۔

(ایک دم بڑے زور سے نعرۂ تکبیر بلند ہوتا ہے۔ جنگ کا ہنگامہ بہت بڑھ جاتا ہے۔)

شمشیر علی: میرے حضور!

سید احمد: شمشیر علی!

شمشیر علی: حضور آپ نے کہا تھا۔ یہ تو تلوار۔ یہ تمہارے گلے کے لیے نہیں ہے۔ ہاتھوں کے لیے ہے اور میرے ہاتھوں نے اس تلوار سے پورا پورا کام لیا ہے۔ میں نے وہ فرض ادا کر دیا ہے جو آپ نے میرے سپرد کیا تھا۔ اپنی تلوار واپس لیجیے۔

سید احمد: میرے بھائی! میرے بیٹے!

شمشیر علی: خدا حافظ یا امیر۔

سید احمد: خدا حافظ! خدا حافظ!

(جنگ کا ہنگامہ تیز سے تیز ہوتا جا رہا ہے)

بہرام خاں: یا حضرت! آپ دشمنوں میں گھر گئے ہیں۔ ادھر آئیے!

سید احمد: نہیں بہرام خاں! آگے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔
اللہ اکبر! (ذرا اور بلند) اللہ اکبر! (انتہائی گرجدار آواز میں) اللہ اکبر!

(جنگ کا ہنگامہ مدھم پڑ جاتا ہے۔ بہرام خاں کی آواز
ابھرتی ہے)

بہرام خاں: حسن علی! میں نے حضور کو آگے بڑھنے سے روکا مگر وہ اللہ اکبر کہتے ہوئے دشمن کی صفیں چیرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے گئے! گولیاں ان کے جسم پر برس رہی تھیں۔ تلواریں ان کا راستہ روک رہی تھیں مگر ان کے قدم ایک لمحے کے لیے بھی نہ رکے! پھر میں انہیں نہ دیکھ سکا۔ وہ بہت آگے نکل گئے تھے۔ اور جب میں نے انھیں دیکھا تو وہ خون میں شرابور زمین پر پڑے تھے۔ ان کا سر جسم سے کٹ کر۔ اوہ میرے اللہ! مجھے یہ منظر بھی دیکھنا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، آج نسیم جانفزا مجھے یوں چھو رہی ہے جیسے جنّت کا ایک دریچہ کھل گیا ہے۔ مگر آج ان کے لیے ایک دریچہ نہیں۔ جنّت کے سارے دریچے۔ سارے دروازے کھل گئے ہیں۔ انہوں نے بالاکوٹ کی جلوہ گاہ کو شہادت گاہ بنا دیا ہے۔ اے زمین بالاکوٹ! تو خوش نصیب ہے تیرے ذرّوں کی پیشانیاں امیر المجاہدین حضرت سید احمد شہید کے مقدس خون سے چمک رہی ہیں۔ اور ہمیشہ چمکتی رہیں گی!

(غمناک موسیقی کے ساتھ فیڈ آؤٹ)

نواب جھجرؔ

کردار:-

نواب ججھر نجابت علی خاں

والدہ ——— نواب کی ماں

زرینہ ——— ملازمہ

فقیر ——— شہباز

غیاث ——— ایک غدار۔ زرینہ کا منگیتر

الیگزنڈر ——— انگریز فوجی افسر

دلیر خاں ——— ایک مجاہد

O

مقام : نواب جھجر نجابت علی خان کا محل

وقت : علی الصبح

(نواب صاحب کی معمر والدہ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد بارگاہِ ایزدی
میں دست بدعا ہے)

والدہ : "اے ربِ کریم! عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے۔ بارِ الٰہا! وہ عزت جو تُو نے اس خاندان کو بخشی ہے اس کی حفاظت کر۔ اسے سلامت رکھ پروردگار! ہمارے ملک میں جو آندھی اُٹھی ہے۔ اس سے میرے بچے کو محفوظ رکھ۔ آج مجھے لگتا ہے جیسے چاروں طرف سے اندھیرا اُمنڈتا چلا آرہا ہے۔ کہیں ہمارے وطن پر سیاہ رات نہ چھا جائے۔ میرے نجابت خاں کو توفیق دے کہ وہ اس اندھیرے میں چراغِ روشن بن کر اُجالا پھیلائے۔ ورنہ خالقِ کائنات ہمیں عزت سے موت کے پردے میں لپیٹ لے۔ پروردگار! تیری رحمت، تیرے فضل و کرم کی آرزو مند ہوں۔ آرزو مند کو مایوس نہ ہونے دے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

وہاں خادمہ کو آواز دیتی ہے۔ خادمہ زرینہ آتی ہے)

ماں : زرینہ! اے زرینہ!!

زرینہ : جی بی بی اماں!

ماں : نجابت خاں کہاں ہے؟

زرینہ : خبر نہیں حضور! صبح ہی صبح محل کا دروازہ کھُلا تھا۔

ماں : اتنے سویرے وہ کہاں جا سکتا ہے؟

زرینہ : میرا خیال ہے اعلیٰ حضرت بہت سویرے محل سے باہر تشریف

لے گئے ہیں۔

ماں : لے یہ مصلّےٰ اور تسبیح میرے کمرے میں رکھ دے جا کر۔

زرینہ : بہتر حضور!

ماں : (اپنے آپ سے مخاطب) صبح ہی صبح کہاں چلا گیا ہے خدا خیر کرے۔

(زرینہ کی کسی قدر دُور سے آواز اُبھرتی ہے)

زرینہ : بابا! کہہ جو دیا ہے وہ گھر پر نہیں ہیں۔

ماں : زرینہ! کون ہے؟

زرینہ : حضور! ایک فقیر ہے۔

ماں : تو خیرات دے دو۔

زرینہ : حضور! عجب قسم کا فقیر ہے۔ کہتا ہے میں تو نواب صاحب ہی کے ہاتھ سے خیرات لوں گا۔

ماں : نواب صاحب کے ہاتھ سے! وہ کیوں؟

(زرینہ فقیر کے ساتھ آتی ہے)

کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟

فقیر : جناب! کشکول ہاتھ میں لے کر کون کسی کے دروازے پر دستک دیتا ہے؟

ماں : فقیر ہو تو ہماری خادمہ سے یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ نواب صاحب کے ہاتھ سے ہی خیرات لوں گا؟

فقیر : نواب صاحب جو کچھ دیتے ہیں وہ اور کون دے سکتا ہے؟

ماں : جاؤ پریشان نہ کرو۔ زرینہ! میرے چھپر کھٹ کے پاس اشرفیوں کا توڑا پڑا ہے۔ لے آ۔

فقیر : یہ فقیر اشرفیوں کا حاجت مند نہیں ہے۔

ماں : اشرفیوں کا حاجت مند نہیں ہے۔ کیسا فقیر ہے تُو؟

فقیر : درویش دل کا غنی ہوتا ہے۔ کشکول میں کوئی محبت سے سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ہی ڈال دے تو سمجھتا ہے اسے پوری دنیا مل گئی ہے اور محبت نواب صاحب ہی دے سکتے ہیں۔

ماں : بیٹھ جاؤ دروازے کے پاس اور انتظار کرو۔

فقیر : ضرور کروں گا۔ بڑی خوشی سے کروں گا۔ اللہ اس عالی شان محل کے در و دیوار سدا سلامت رکھے۔

ماں : (ہولے سے) آمین۔

(فقیر چلا جاتا ہے۔ دُور سے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کا شور سنائی دیتا ہے۔ آواز بتدریج قریب آتی جاتی ہے)

ماں : زرینہ! دیکھ کون آرہا ہے۔ یہ تو میرے بچے کے گھوڑے کی مانوس ٹاپ لگتی ہے۔

زرینہ : سرکار تشریف لے آئے ہیں۔

نواب صاحب : (زور سے) تہور خاں! گھوڑا اصطبل میں لے جاؤ۔

ماں : (آواز دیتے ہوئے) نجابت بیٹا۔

(نجابت خاں آتا ہے)

نواب : اماں جان! آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟

ماں : بیٹا تم کب گئے تھے۔ کہاں گئے تھے۔ کیوں گئے تھے؟

نواب صاحب : اماں جان جی چاہا کہ صبح سویرے گھوما جائے۔ بڑا لُطف آیا ہے۔

ماں : نجابت خاں تو اکیلا محل سے نکل جاتا ہے۔ بیٹا! یہ اچھی بات نہیں ہے جانتا نہیں ہے ملک کے حالات کیا ہیں۔

نواب : اماں! زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک زندہ ہیں حالات سے کیوں ڈریں۔ جب موت آئے گی۔ مرجائیں گے۔ آپ کیوں

فکر کرتی ہیں ؟

ماں : حالات بگڑ گئے ہیں اور برابر بگڑتے جا رہے ہیں۔ رات سے میرا دل بڑی طرح دھڑک رہا ہے۔

نواب : کیوں اماں جان ؟

ماں : رات میں نے بڑا خوفناک خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ آسمان کے ایک کنارے سے ایک پرندہ اُڑنے لگا ہے اور جیسے جیسے نیچے آتا جاتا ہے اس کے بازو پھیلتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہمارے محل کے اُوپر پہنچتا ہے تو ہر طرف اس کے سیاہ پر چھا جاتے ہیں۔ اور ان سیاہ پروں سے۔ اُف میرے اللہ۔

نواب : ان سیاہ پروں سے کیا ہوتا ہے اماں جان ؟

ماں : ان سے لہو کے قطرے گرنے لگتے ہیں۔ سُرخ سُرخ قطرے۔

نواب : اماں جان ! اصل میں آپ موجودہ بدامنی اور فرنگیوں کی سرگرمیوں سے بڑی پریشان ہیں۔ یہ اس پریشانی کا نتیجہ ہے کہ ایسے خواب آپ کو ستاتے رہتے ہیں۔

ماں : سیاہ پرندہ اور سیاہ پروں سے لہو ٹپکتا ہوا۔ بیٹا آثار اچھے نہیں ہیں۔ اس ملک پر تاریک رات آنے والی ہے۔

نواب : رات آنے والی ہے تو اُسے کون روک سکتا ہے آپ پریشان نہ ہوں اماں جان ! کل ڈاک سے مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اپنی ایک فارسی غزل بھجوائی تھی۔

ماں : کون ! اپنے مرزا نوشہ کی بات کرتے ہو ؟

نواب : جی ہاں۔ بڑی اچھی غزل ہے اس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

تو نالی از خلشِ خار و تنگدی کہ سپہر سرِ حسین علی بر سناں بگرداند

اماں جان یہ چرخ کج رفتار جب رسولِ اکرم کے نواسے کا سر نیزے پر لٹکا کر گھما سکتا ہے تو ہم کس گنتی میں ہیں ؟

ماں : اللہ رحم کرے۔

نواب : اماں دُعا کریں کہ اللہ مجھے حسین ابنِ علیؓ کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے۔

ماں : آمین : میں نے تو اللہ پاک کی بارگاہ میں بھی دُعا کی ہے کہ عزت کی زندگی دے اور عزت کی موت دے۔ تجھے پیاس لگی ہوگی بیٹا! شام حکیم صاحب نے نیا شربت بنوا کر بھیجا ہے۔

نواب : پیاس نہیں ہے ابھی۔

ماں : بیٹا : ابھی ابھی ہمارے دروازے پر ایک عجیب فقیر آیا تھا۔ کہتا تھا میں نواب صاحب کے ہاتھ سے ہی خیرات لوں گا۔

نواب : کہاں ہے وہ فقیر؟

ماں : چلا گیا ہوگا۔

نواب : کون ایسا فقیر ہو سکتا ہے؟

(ذرا سا وقفہ)

فقیر : (سرگوشی کے سے انداز میں) نواب صاحب میں ہوں۔

نواب : شہباز!

فقیر : دلیر خاں نے یہ روٹی بھیجی ہے۔ اس میں آپ کو ایک کاغذ ملے گا۔ اس میں ہمارا پروگرام درج ہے۔

نواب : میں ابھی ابھی اُن لوگوں سے مل کر آیا ہوں جو سرائے ولی شاہ میں جمع ہیں۔

فقیر : نواب صاحب!

نواب : کہو۔

فقیر : دلیر خاں نے کہا ہے کہ جاسوسوں سے محتاط رہیے۔ فرنگیوں نے جابجا اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔

نواب : یہاں جاسوس کہاں؟

فقیر: احتیاط رکھیے۔ خبردار رہیے۔ خدا حافظ (بلند آواز میں) اللہ آپ کی حکومت سدا سلامت رہے۔ عزت بڑھے۔ مرتبہ بلند ہو۔ آپ نے ہم پر ترس کھایا ہے۔ اللہ آپ پر ترس کھائے۔

نواب: زرینہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟

زرینہ: حضور۔ وہ کم بخت میری اوڑھنی۔ پتا نہیں زمرد کی بچی نے کہاں گم کر دی ہے۔

نواب: تمہاری اوڑھنی یہاں کہاں آگئی؟

زرینہ: حضور کل زمرد نے چھین لی تھی۔ چھپا دی ہے کہیں۔ بڑی شریر ہے حضور۔

نواب: جاؤ اپنا کام کرو۔

زرینہ: جاتی ہوں حضور! (منظر کی تبدیلی۔ زرینہ کا کمرہ)

غیاث: تو نواب صاحب نے کیا کہا۔

زرینہ: میں تو بری طرح ڈر گئی تھی مگر نواب صاحب نے صرف یہی کہا جاؤ اپنا کام کرو۔

غیاث: بڑی ذہین ہو زرینہ۔ بڑی جلدی بہانہ گھڑ لیا۔

زرینہ: یونہی میرے دماغ میں یہ بات آگئی۔ زمرد نے تو میری اوڑھنی کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

غیاث: فقیر روٹی لے کر چلا گیا تھا؟

زرینہ: ہاں کچھ کہا بھی تھا۔

غیاث: کیا کہا تھا؟

زرینہ: آخر میں یہ کہا تھا کہ نواب صاحب جاسوسوں اور دشمنوں سے ہوشیار رہیے۔

غیاث: یہ تو آخر میں کہا تھا۔ اس سے پہلے کیا کہا تھا؟

زرینہ: وہ لفظ میں نہیں سن سکی۔

غیاث : زرینہ! اصل چیز تو روٹی کی ہے۔ باغیوں کے رہنما آصف نے سب کچھ روٹی کے اندر رکھ دیا ہوگا۔ کوشش کرو کہ روٹی میں سے جو کاغذ نکلا ہے وہ لے آؤ۔

زرینہ : یہ ممکن نہیں غیاث!

غیاث : یہ بات تم کہہ رہی ہو زرینہ اور اپنے غیاث سے کہہ رہی ہو۔

زرینہ : غیاث دیکھو میں تمہارے لیے کیا کچھ کر رہی ہوں۔ نواب صاحب کا نمک کھا رہی ہوں اور ان کی مخبری بھی کر رہی ہوں۔ تم نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ غیاث کبھی کبھی تنہائی میں اپنی حالت پہ غور کرتی ہوں تو سچ مجھے اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے۔

غیاث : محبت میں یہی کچھ ہوتا ہے زرینہ! تم میری خاطر نہیں محبت کی خاطر یہ سب کچھ کر رہی ہو۔ سُنا تم نے؟

زرینہ : محبت کی خاطر انسان کیا اس قدر گر جاتا ہے؟

غیاث : یہ نہ کہو زرینہ! محبت قربانی چاہتی ہے۔

زرینہ : میں تمہارے لیے اپنی جان تک قربان کر سکتی ہوں۔ مگر یہ کام۔ یہ ذلت ہے غیاث ذرا سوچو۔ تم مجھ سے کتنا بُرا اور ذلت انگیز کام کروا رہے ہو۔ وہ تو صبح نواب صاحب نے دیکھا تھا۔ اگر بی اماں دیکھ لیتیں تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ بی اماں بہت سخت ہیں۔ جب جلال میں آتی ہیں تو محل کی دیواریں تک کانپنے لگتی ہیں۔

غیاث : محل کی دیواریں (زوردار قہقہہ) یہ محل اور اس کی دیواریں؟

زرینہ : ہنس کیوں رہے ہو غیاث؟

غیاث : زرینہ! یہ محل جو کسی زمانے میں نواب صاحب بہادر کی عظمت اور شان و شوکت کا نشان سمجھا جاتا تھا لیکن اب اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اس کی روح زخمی ہو چکی ہے۔ اس کی دھڑکنیں مدھم پڑ چکی ہیں۔ اس کی دیواریں سرنگوں

ہونے کے لیے صرف ایک اشارے کی منتظر ہیں۔ محل کی زندگی ختم ہو رہی ہے۔ ختم ہو چکی ہے۔

زرینہ : نہیں، نہیں، نہیں غیاث!

غیاث : خود کو دھوکہ نہ دو زرینہ! یہ جو ملک میں تم ہنگامہ دیکھ رہی ہو۔ یہ محض پانی کا بلبلا ہے جو آن کی آن میں مٹ جائے گا۔ چند روز کی بات ہے۔ ہندستان کی مرکزی حکومت ایک گھن لگا پیڑ ہے ابھی گرا کہ ابھی گرا اور باغی لوگ اس منزل کی طرف رواں ہیں جہاں موت ان کا انتظار کر رہی ہے۔ فرنگیوں کا آفتاب اس ملک کے آسمان پر چمکنے والا ہے اور اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ چمکے گا، ہر طرف چمکے گا۔

زرینہ : کیسی دکھ والی بات کرتے ہو۔

غیاث : پگلی دکھ کیسا، انگیز بہادر نے مجھ سے کیا وعدہ کیا ہے جانتی ہو؟

زرینہ : میں نہیں جانتی۔

غیاث : انہوں نے کہا ہے کہ جھجّر کی آدھی مالگزاری مجھے ملا کرے گی۔ عیش ہو جائیں گے۔ میری زرینہ! ہو سکتا ہے یہ محل جس میں آج تم ایک ملازمہ ہو، بغاوت فرد ہونے پر تم اس میں مالکن بن کر رہو۔

زرینہ : سچ!

غیاث : تمہارا غیاث تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میری ذات پر اعتماد کرو زرینہ! اور سمجھ لو کہ جو کچھ تم کر رہی ہو وہ آئندہ نہایت شاندار زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ قسمت تم پر اس قدر مہربان ہوگی کہ تمہارا سارا ماضی ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔

زرینہ : مگر غیاث! یہ فرض جو تم نے میرے سپرد کیا ہے ——

غیاث : (فقرہ کاٹتے ہوئے) بڑا کٹھن ہے۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا، لیکن زرینہ! یہ بھی تو دیکھو اس کے بعد ہوگا کیا۔ ساری عمر کا عیش ہے۔

(زرینہ خاموش رہتی ہے)

سوچ کیا رہی ہو؟

زرینہ : کچھ نہیں۔

غیاث : زرینہ بڑا اچھا کام کر رہی ہو بس وہ لا دو پھر مزے ہی مزے ہیں۔

زرینہ : وہ کیا؟

غیاث : کاغذ جو روٹی میں سے نکلا ہے۔

زرینہ : وہ کیونکر لا سکتی ہوں؟

غیاث : کوشش کرو ہو سکتا ہے کہ وہ نواب صاحب کے تکیے کے نیچے پڑا ہو۔

زرینہ : نواب صاحب کی عادت ہے کہ وہ خاص کاغذات اور چابیاں وغیرہ تکیے کے نیچے رکھ دیا کرتے ہیں۔ مگر اُن کی خواب گاہ میں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہے۔

غیاث : یہ کام تمہیں بہر صورت کرنا ہوگا۔

زرینہ : اچھا اب تم جاؤ۔ بی اماں کے نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ انھیں وضو کرانا ہے۔

غیاث : میں جاتا ہوں۔ خدا حافظ۔

زرینہ : خدا حافظ۔ (منظر کی تبدیلی)

(انگریزوں کے فوجی افسر الیگزنڈر کا خیمہ)

الیگزنڈر : ویل مسٹر گیاث تم آگیا ہے۔

غیاث : جی صاحب بہادر۔

الیگزنڈر : کیا خبر لایا ہے؟

غیاث : صاحب بہادر کام بالکل ٹھیک ہو رہا ہے۔ اب معلوم ہو گیا ہے کہ باغیوں کا سرغنہ نواب کو کس طرح خبریں پہنچاتا ہے۔

الیگزنڈر : ہم کو معلوم ہو گیا ہے۔ آصف روٹیاں بھیجتا ہے۔ ہمارا اردلی ایک روٹی لایا ہے مگر وہ خالی ہے۔

غیاث : آپ کے اردلی نے دھوکا کھایا ہے۔ صاحب بہادر آصف نواب

کو جو روٹی بھیجتا ہے اس میں پیغام وغیرہ بند کر کے بھیجتا ہے۔

الیگزنڈر: YES, YES ٹم ٹھیک بولتا ہے وہ BAGGER ہم بولتا ہے وہ وہ کون ہوتا ہے؟

غیاث: وہ فقیر؟

الیگزنڈر: YES YES

غیاث: آصف کا کوئی معتبر آدمی ہے۔

الیگزنڈر: کل ہم دیکھے گا وہ ادھر کیسے جاتا ہے۔

غیاث: صاحب بہادر میں کوشش کر رہا ہوں کہ روٹی میں سے جو کاغذ نکلا ہے وہ حاصل کر لوں۔

الیگزنڈر: GOOD ضرور حاصل کرو ہم ٹم پر بہت بہت کھوس ہو گا۔

غیاث: صاحب بہادر کی مہربانی چاہیے۔

الیگزنڈر: ہم ٹم پر بڑا بہت بڑا مہربانی کرے گا مسٹر گیاث۔

غیاث: جی صاحب بہادر۔

الیگزنڈر: جنرل ولسن کا آرڈر آیا ہے کہ نواب کو کھتم کیا جائے۔

غیاث: نواب بہت بڑی طاقت ہے صاحب بہادر۔

الیگزنڈر: لیکن یہ کام کرنا ہو گا۔

غیاث: یہ کام ضرور ہو گا مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔

الیگزنڈر: تم کہتا ہے وقت نہیں آیا۔ یہ نواب اندر ہی اندر تاکتور ہو رہا ہے۔

غیاث: مسٹر الیگزنڈر! دشمن کو مارنے سے بہتر یہ ہے کہ اُسے بے دست و پا کر دیا جائے۔ اگر اس کی تمام سرگرمیاں ختم کر دی جائیں اور اس کی ساری طاقت چھین لی جائے تو ہمارا مقصد بہتر طور پر حل ہو سکتا ہے۔

الیگزنڈر: جنرل ولسن یہ نہیں چاہتا۔

غیاث: اگر اس مرحلے پہ نواب کو گرفتار کر لیا گیا تو باغیوں میں بے پناہ

جوش پیدا ہو جائے گا۔

الیگزنڈر: تم بالکل ٹھیک بولتا ہے مسٹر گیاث! ابھی اسے گرفتار کرنا نہیں مانگتا۔ مگر وہ ہم چاہتا ہے۔

غیاث: آپ کا مطلب ہے وہ کاغذ جو نواب کو رٹی میں ملا ہے۔

الیگزنڈر: YES وہی کاگج۔ ہمارا کھیال ہے کہ اس میں کوئی بہت بڑا راج ہو گا۔

غیاث: یقیناً کوئی بہت بڑا راز ہو گا آپ مطمئن رہیں میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔

الیگزنڈر: WEL DONE مسٹر گیاث۔ دیکھا ہم تمہارے لیے کیا کرتا ہے۔

غیاث: اب میں جاتا ہوں کل آؤں گا۔

الیگزنڈر: وہ کاگج لے کر۔

غیاث: وہ کاغذ لے کر آؤں گا۔ (منظر تبدیل ہوتا ہے)

(ریاست جھجر کا ایک نواحی جنگل۔ رات کا وقت ایک بجے دلیر خاں اپنے ساتھیوں سے گفتگو کر رہا ہے)

دلیر خاں: شہباز! تم نے میرا پیغام صبح نواب صاحب تک پہنچا دیا تھا؟

شہباز: پہنچا دیا تھا دلیر خاں! اور ساتھ ہی اس بات کی بھی تاکید کر دی تھی کہ وہ جاسوسوں سے ہوشیار رہیں۔

دلیر خاں: سرائے میر شاہ کے لوگوں کا کیا حال ہے؟

شہباز: ان کے پاس ہتھیاروں کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے۔

دلیر خاں: یہی حالت ہماری بھی ہے۔ اس موقع پر ہتھیاروں کی کمی سے بڑا ناخوشگوار اثر پڑے گا۔

شہباز: دلیر خاں ہوشیار۔

دلیر خاں: (دور سے) ہوشیار۔

نواب : مَیں ہوں نجابت علی۔

دلیر خاں : نواب صاحب! آپ آدھی رات کے وقت یہاں؟

نواب : فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔

دلیر خاں : نواب صاحب اس وقت آپ کو محل سے کسی صورت بھی باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔

نواب : میری جان میرے پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔ موت کا وقت ایک لمحے کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ مجھے تم نے اطلاع دی تھی کہ ہتھیاروں کی بڑی کمی ہے اور ہمارے ساتھیوں میں کچھ مایوسی سی پیدا ہو گئی ہے۔

دلیر خاں : جی ہاں۔

نواب : مَیں نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ سرائے میر شاہ میں دوپہر کو سامانِ حرب کا خاصا معقول حصّہ بھیج دیا گیا تھا۔ یہاں بھی پہنچ جاتا۔ مگر مجھے خبر ملی تھی کہ گوروں کے جاسوس چاروں طرف محل کے اِردگرد پھیلے ہوئے ہیں۔

دلیر خاں : کل سے فرنگیوں کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئی ہیں۔

نواب : شہباز!

شہباز : جی نواب صاحب۔

نواب : خیمے کے دروازے پر میرے گھوڑے کے پاس ایک صندوق پڑا ہے اسے لے آؤ۔

دلیر خاں : نواب صاحب! یہ فرض ہمارا تھا اور ہمارا ہونا چاہیے۔ آپ نے کیوں تکلیف کی ہے؟

نواب : دلیر خاں! جنگِ آزادی سے پہلے میں نواب تھا اور تم لوگوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر وہ زمانہ گزر چکا ہے۔ مَیں نواب ہونے کے باوجود آج نواب نہیں ہوں۔ جنگِ آزادی کا محض ایک سپاہی ہوں اور میری آرزو ہے کہ ہندوستان کی تاریخ مجھے صرف اسی حیثیت سے پہچانے۔

دلیر خاں : آپ کو جنگ آزادی کے قائد کی حیثیت سے پہچانا جائے گا۔

نواب : دلیر خاں ! میں کچھ زیادہ پُر اُمید نہیں ہوں۔

دلیر خاں : کس بارے میں نواب صاحب ؟

نواب : اِس جدوجہد کے بارے میں جسے جنگِ آزادی کہنا چاہیے ناامیدی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری مرکزیت ختم ہو گئی ہے۔ ہندستان کا شہنشاہ اِس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ آج اِس کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہی۔ لال قلعے کی ساری چمک دمک خاک میں مِل گئی ہے۔ مرکزیت کے ختم ہو جانے سے ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی طاقتیں خودرو پودوں کی طرح پھوٹ نکلی ہیں۔ ہر طاقت کے سامنے اپنا ذاتی مفاد ہے یہ ذاتی مفاد فرنگیوں کو پورے ملک پر قبضہ کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

دلیر خاں : آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔

نواب : یہ حالت بڑی تکلیف دہ ہے۔

دلیر خاں : سخت اذیت ناک ہے۔ ملک کا مستقبل بڑے خطرے میں ہے۔

نواب : مگر دلیر خاں ! آج ہمارے سامنے صرف ایک ہی فرض کا احساس ہونا چاہیے اور وہ فرض ہے آزادی کی جنگ۔

دلیر خاں : آزادی کی جنگ جو ملک کے ہر حصّے میں لڑی جائے گی۔

نواب : ہر حصّے میں، ہر شہر میں، ہر قریے میں، ہر گاؤں میں ہمیں یہ سوچ کر یہ جنگ لڑنی ہے کہ ہم سات سمندر پار سے آتے ہوتے اِن سفید فام تاجروں کو ملک سے باہر نکال دیں گے۔

دلیر خاں : انشاء اللہ۔

نواب : اگر ہم بدقسمتی سے جنگ ہار گئے تو ہندوستان کی قسمت کے روشن دنوں پر غلامی کی ایک بھیانک سیاہ رات چھا جائے گی۔ اِس کے بعد کب صبح آئے گی۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔

دلیر خاں : نواب صاحب! مایوسی کے اِن اندھیروں میں بھی کچھ روشنی کے مینار ہمیں دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ ہماری تاریخ نواب سراج الدولہ، حیدر علی، سلطان ٹیپو، حافظ رحمت اللہ کے کارناموں سے روشن ہے۔

نواب : الحمد للہ۔ آزادی کے علمبردار آج بھی موجود ہیں۔ جن کی تلواریں تاریک رات میں ستاروں کی طرح چمک رہی ہیں اور جن کے قدم برابر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ جو اِس جنگ میں اپنے مقدس لہو کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے! ہم انہی بہادروں کی قیادت میں اپنی تگ و دو جاری رکھیں گے۔

دلیر خاں : خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔

نواب : دلیر خاں ہو سکتا ہے کہ تنظیم کے نہ ہونے سے بعض مقامات پر ہمارے بہادروں کو کامیابی نصیب نہ ہو!

دلیر خاں : یہ ہو رہا ہے۔ افسوس ہمارا کوئی مرکز نہیں ہے۔

نواب : اگر ہر جگہ شکست ہو گئی تو جھجر کے محل کے دروازے کھل جائیں گے اور آزادی کی جنگ اِسی محل کی دیواروں کے اندر لڑی جائے گی۔

دلیر خاں : یہ آخری معرکہ ہوگا۔

نواب : خدا کرے یہ آخری معرکہ نہ ہو۔ خدا کرے اِس ملک کا ہر گھر ایک مضبوط قلعہ بن جائے۔

دلیر خاں : آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے۔

نواب : ہمیں خدائے رحیم و کریم پہ پورا پورا بھروسہ ہے۔ اچھا دلیر خاں! اب میں چلتا ہوں۔ اماں نہ جانے کتنی بار میرا خالی پلنگ دیکھ کر بے قرار ہو چکی ہوں گی۔ خدا حافظ۔

دلیر خاں : خدا حافظ۔

(منظر کی تبدیلی، نواب صاحب کی خوابگاہ موسیقی آہستہ آہستہ اُبھرتی ہے اور بتدریج بلند ہوتی ہے۔ جس وقت بی اماں "لفظ زرینہ" کہتی ہے

تو موسیقی اپنے نقطۂ انتہا پر پہنچ جاتی ہے)

زرینہ : (لہجے میں خوف کی شدت سے ارتعاش) بی اماں؟ جی! بی اماں

ماں : تم یہاں کیا کرنے آئی تھیں؟

زرینہ : وہ — بی اماں! صفائی کرنے آئی تھی۔

ماں : اس طرح صفائی نہیں کی جاتی۔ میں کافی دیر سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔ چوروں کی طرح تم قدم اٹھاتی ہوئی یہاں آئی ہو۔

زرینہ : نہیں بی اماں۔ میں صرف۔

ماں : جھوٹ مت بولو۔ ایک مجرم ہی بار بار ادھر ادھر دیکھتا ہے اور اپنے سائے سے بھی کانپ جاتا ہے۔ تمہیں پہلے یہاں کبھی آنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اور پھر تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نواب صاحب کی خوابگاہ میں کسی کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ تمہیں اس کا علم نہیں تھا کیا؟

زرینہ : میں بھول گئی تھی۔

ماں : تم بالکل نہیں بھولی تھیں۔ البتہ تم یہ بات بھول گئی تھیں کہ تم نے اس خاندان کا نمک کھایا ہے اور آج تم جو جرم کر رہی ہو وہ تمہارے ماتھے پر ذلت کا ہمیشہ رہنے والا داغ بن جائے گا۔

زرینہ : ایسا نہ کہیئے بی اماں! ایسا نہ کہیئے۔

ماں : کیوں نہ کہوں۔ تم نے اس گھر میں پرورش پائی ہے تمہیں یہاں عزت ملی ہے۔ ہر طرح راحت میسر آئی ہے۔ مگر تم یہ بھول گئیں۔ بتاؤ، کیا ارادہ لے کر آئی تھیں اور کس نے تم کو اس جرم کی ترغیب دی تھی؟ بولو! (گرج کر) بولو!

زرینہ : بی اماں۔ میں۔ میں۔

ماں : بولو۔ جانتی ہو کس کے سامنے کھڑی ہو۔ ابھی میرے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ ایک نازک شاخ کی طرح تمہاری گردن مروڑ کر رکھ دوں۔

زرینہ : ڈرتے ہوئے) بی اماں۔

ماں : تمہیں سب کچھ اُگلنا ہوگا۔ سب کچھ فی الفور بتا دینا ہوگا۔ جو کچھ اپنے گناہگار دل میں لے کر آئی ہو وہ چھپا کر یہاں سے باہر نہیں جا سکتیں۔ کہو کیا ارادہ تھا تمہارا۔ کیا چیز لینے آئی تھیں؟

زرینہ : کچھ نہیں۔

ماں : کچھ نہیں۔ (زرینہ زور سے چیخ مارتی ہے)

زرینہ : بی ماں! خدا کے لیے۔

ماں : بولو۔ بتاؤ۔

(نواب صاحب داخل ہوتے ہیں)

نواب : کیا ہوا اماں جان! اسے چھوڑ دیں۔

ماں : اس مجرم کو، اس بدبخت نمک حرام کو چھوڑ دوں؟

نواب : ہوا کیا ہے؟

ماں : چوری چوری تمہاری خواب گاہ میں داخل ہو کر کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔ میں نے اس کی مجرمانہ نظروں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کی نیت نیک نہیں ہے۔ اس کا پیچھا کرتی رہی۔ اور عین موقع پر اسے پکڑ لیا۔ پوچھتی ہوں تو بتاتی نہیں۔ میں اسے زندہ یہاں سے باہر نہیں نکلنے دوں گی۔ زرینہ! کیا بات ہے فوراً بتا!

(زرینہ کی چیخ)

نواب : اماں جان! اسے میرے حوالے کر دیں۔

ماں : نہیں میں خود اسے سزا دوں گی۔ دیکھتی ہوں کس طرح نہیں بتاتی۔

نواب : اماں جان آپ چھوڑ دیں اسے، مجرم کو سزا دینا میرا کام ہے۔

ماں : تم نرمی برتو گے! یہ کسی رُو رعایت کی مستحق نہیں ہے۔

نواب : میں جانتا ہوں ایسے مجرموں کو کیا سزا دی جانی چاہیے

(گرج کر) زرینہ!

زرینہ : (سہمی ہوئی آواز میں) جی!

نواب: میرے ساتھ آؤ! نکلو باہر، بے شرم، بے حیا۔

(ذرا سا وقفہ)

نواب: (آواز میں نرمی) زرینہ!

زرینہ: جی!

نواب: میں جانتا ہوں تم ایک جرم کے ارادے ہی سے میری خواب گاہ میں گئی تھیں۔ تمہاری بدنیتی تمہارے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ تم سے یہ توقع نہیں تھی۔

(زرینہ نواب صاحب کے آخری لفظ پر زار و قطار رونے لگی ہے)

میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔

زرینہ: (روتے ہوئے) حضور۔ میں مجرم ہوں!

نواب: ٹھیک ہے۔ تم مجرم ہو۔ مگر تم نے اب تک اس خاندان کی خدمت کی ہے۔ میں تمہیں کوئی سزا نہیں دوں گا۔ صرف یہ سزا ہے کہ اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔ ابھی —— اسی وقت محل کے دروازے سے نکل جاؤ اور زندگی بھر ادھر کا رُخ نہ کرو۔ جاؤ۔ مگر ٹھہرو۔

زرینہ: جی۔

نواب: ایک بات بتاؤ۔

زرینہ: جی۔

نواب: اگر تمہاری ماں کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی جائیں تو تم اطمینان سے یہ منظر دیکھو گی؛ تمہارے دل کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی؟

زرینہ: ہوگی۔

نواب: ہمارا وطن ہماری ماں ہے۔ اس کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ آج وقت آیا ہے کہ ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے مگر تم زرینہ! تم کیا کر رہی ہو!

زرینہ: (زار و قطار روتے ہوئے) حضور! خدا کے لیے یہ لفظ نہ کہیں۔

نواب : جاؤ۔ چلی جاؤ۔ یاد رکھو جُرم کا دھبہ صرف آنسوؤں سے نہیں
دھویا جا سکتا۔

(منظر کی تبدیلی موسیقی زیادہ وقفے کے لیے ہوگی)

(الیگزنڈر کا خیمہ۔ الیگزنڈر بڑے اضطراب کے عالم میں خیمے
کے اندر ٹہل رہا ہے۔ غیاث آتا ہے)

الیگزنڈر : گیاث! تم اتنے ڈِن کہاں رہا۔ ہم نے تمہارا بہت انتظار کیا ہے۔
غیاث : کیا کہوں سرکار بہادر۔ کوئی خاص بات نہیں بنی تھی۔
الیگزنڈر : وہ پیپر کہاں ہے؟
غیاث : کاغذ نہیں مِل سکا اسی لیے تو نہیں آیا۔
الیگزنڈر : کیا بات ہوا۔ وہ تمہاری بنگیرڑ کا کیا ہوا؟
غیاث : پچھلے کئی دنوں سے اس کی صورت نہیں دیکھ سکا۔
الیگزنڈر : محل سے نہیں آتی؟
غیاث : پتہ نہیں اس سے کیا ہوا ہے۔ میں نے معلوم کرنے کی کوشش
کی تھی کہ کیا محل میں اُس پہ پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔
الیگزنڈر : تو کیا ہوا؟
غیاث : معلوم ہوتا ہے وہ محل میں بھی نہیں ہے۔
الیگزنڈر : محل میں بھی نہیں ہے تو گئی کہاں؟
غیاث : کچھ کہہ نہیں سکتا سرکار بہادر!
الیگزنڈر : جنرل وِلسن سخت ناراج ہے۔ کہتا ہے ابھی تک نواب کیوں نہیں
مارا گیا۔ اسے فوراً پکڑو۔
غیاث : اس وقت وہ باغیوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔
الیگزنڈر : وہ لیڈر ہے اور ساری ہدایات وہ دیتا ہے، تم کیا بولتا ہے۔
غیاث : مجھے اطلاع ملی ہے کہ محل کے چاروں طرف بے شمار لوگ

لڑنے پر تیار کھڑے ہیں۔

الیگزنڈر: اس کا مطلب کیا ہے؟

غیاث: جب تک ان لوگوں کا صفایا نہیں ہو جاتا نواب کی گرفتاری ممکن نہیں ہے۔

الیگزنڈر: DAMN بہت بڑی بات ہے۔

غیاث: حملہ جاری ہونا چاہیے کیونکہ نواب باغیوں کی تنظیم کر رہا ہے۔

الیگزنڈر: WHAT YOU MEAN؟

غیاث: انہیں ٹریننگ دے رہا ہے۔

الیگزنڈر: میں جنرل ولسن کے آرڈر کا انتجار کر رہا ہوں۔

غیاث: حملے کے لیے آرڈر کا انتظار ہے؟

الیگزنڈر: YES (بلند آواز سے) کون ہے آ جاؤ!

غیاث: شاید آرڈر آ گیا ہے۔

الیگزنڈر: YES (ذرا سا وقفہ) آرڈر آ گیا ہے۔ نواب کے محل پر حملہ ہونا چاہیے۔

(موسیقی۔ گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کا شور۔ توپوں کی گھن گرج

(منظر بدلتا ہے)

ماں: نجابت بیٹا! یہ کیسا شور ہے۔ تم کہاں چلے؟

نواب: فرنگیوں نے حملہ کر دیا ہے۔

ماں: مگر تم؟

نواب: محل کے باہر جا رہا ہوں۔

ماں: نجابت۔ نجابت بیٹا! الٰہی میرے بچے کی حفاظت کرنا۔

(جنگ کا شور پورے زور سے ابھرتا ہے۔ نواب کی آواز اس شور میں سے بلند ہوتی ہے)

شاباش بہادرو! اپنے پیارے وطن کے غاصبوں کو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دو۔ آج قدرت نے تمہیں سنہری موقع دیا ہے۔ غلامی کی وہ زنجیریں جو ان سفید چمڑی والے ڈاکوؤں نے تمہاری مادرِ وطن کے پاؤں میں ڈال دی ہیں، انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دو! ہمارا وطن ہمارا ہے، کوئی غیر اس پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ ہمیں آج ان حملہ آوروں کے ناپاک قدموں کو یہاں سے ہمیشہ کے لیے نکال دینا ہے۔ شاباش بہادرو! وطن کے دلیر سپاہیو! شاباش!

(جنگ کا شور تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے)

تہور خاں: حضور! ان لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔ محل کے اندر چلے جائیں۔

نواب: ہرگز نہیں۔ میں سپاہیوں کو چھوڑ کر اپنے لیے پناہ گاہ نہیں ڈھونڈ سکتا۔ میں بھی تمہاری طرح ایک سپاہی ہوں۔

تہور خاں: مگر حضور۔ وہ آ گئے۔ حضور! (تلواروں کے ٹکرانے کا شور چند لمحے جاری رہتا ہے، یکایک اس شور میں زرینہ (زرینہ کی آواز) "اوہ حضور" ابھرتی ہے)

نواب: زرینہ تم!

زرینہ: میں حضور۔ مجرم، گناہگار۔

نواب: یہ تم نے کیا کیا زرینہ! تم کہاں سے تلواروں کے ہجوم میں آ گئیں؟

زرینہ: حضور آپ۔

نواب: میں زندہ سلامت ہوں۔

زرینہ: الحمد للہ۔ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میرا فرض پورا ہو گیا۔

نواب: مگر زرینہ!

زرینہ: آپ نے کہا تھا۔ جرم کا دھبہ صرف آنسوؤں سے نہیں دھویا جا سکتا۔ میں نے اسے اپنے لہو سے دھونے کی کوشش کی ہے۔ کیا دھبہ دھل گیا ہے میرے حضور؟

نواب : (آواز رقت انگیز) ڈھل گیا ہے بیٹی! نہ صرف دھبہ ڈھل گیا ہے بلکہ تم نے اپنے خون سے وہ چراغ روشن کیا ہے جو میرے دل میں ہمیشہ ضوفشاں رہے گا۔

زرینہ : خدا کا۔ شکر ہے۔ لاکھ لاکھ شکر ہے۔

(زرینہ کی موت کی ہچکی)

نواب : اِنّا للّٰہ و اِنّا الیہ راجعون! تہور! زرینہ کی نعش کو انتہائی احترام کے ساتھ محل کے اندر لے جاؤ۔

تہور خاں : بہت اچھا حضور!

(موسیقی، جس کے پس منظر میں جنگ کا ہنگامہ تدریجاً مدھم پڑ جاتا ہے۔ اس عالم میں نواب صاحب کی آواز اُبھرتی ہے)

نواب : اماں جان! وہ فریضہ ادا ہو گیا؟

ماں : (آواز میں رقت) ہاں بیٹا!

نواب : اماں جان!

ماں : کہو میرے لخت جگر!

نواب : میں سوچتا ہوں کل جب جنگِ آزادی کی تاریخ لکھی جائے گی تو نہ جانے اس میں کس کس کا نام شامل ہوگا، مگر یہ لڑکی جس نے اسی جنگ میں اپنی جان قربان کر دی۔ کسی تذکرے میں بھی اس کا نام نہیں ہوگا۔

ماں : تاریخ گمنام انسانوں کو بھول جاتی ہے۔

نواب : بھول جاتی ہے۔ یہ ایک المیہ ہے۔

(جنگ کا ہنگامہ، موسیقی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ دلیر خاں بھاگا بھاگا آتا ہے)

دلیر خاں : حضور! فرنگیوں نے شدید حملہ کر دیا ہے۔ سپاہی محل کی طرف آ رہے ہیں۔

نواب : اماں جان! خدا حافظ! اگر میں واپس نہ آیا تو مجھے دُودھ بخش دینا۔

ماں : (گلوگیر آواز میں) خدا۔ حافظ!

(جنگ کا ہنگامہ تیز تر ہو جاتا ہے۔ یہ ہنگامہ بڑی شدت اختیار کر جاتا ہے۔ ایکدم الیگزنڈر کا وحشیانہ قہقہہ بلند ہوتا ہے)

الیگزنڈر : پکڑ ا گیا نواب کا بچّہ!

غیاث : جی سرکار بہادر۔ مَیں مبارک باد دینے کے لیے آیا ہوں۔

الیگزنڈر : ہم تم پہ بہت کھوس ہے۔ تمہاری مبارک باد قبول کرتے ہیں۔

غیاث : آپ سرکار بہادر اس فدوی کو اس کا انعام بھی دیں گے۔

الیگزنڈر : ہم دونوں کام کرے گا۔ نواب کو وہ سجا دے گا کہ دنیا یاد رکھے گی۔ ہم اسے توپ کے منہ میں ڈال دے گا۔ ساری رات یونہی رہے گا اور صبح ٹوپ چلے گا اور تمہیں انعام دے گا۔ لو اپنا انعام۔

(فائر کی آواز)

غیاث : او۔ ہائے۔ ظالم انگریز۔ بدبخت کمینے۔

الیگزنڈر : تجھے یہی انعام ملنا چاہیے تھا۔ تُو نے اپنے وطن سے گداری کی۔ ہم سے کیا کرے گا؟ گدار کی یہی سجا ہے۔

(جنگ کے ہنگامے کے بعد اب غمناک موسیقی جاری ہے۔ بی اماں جانے نماز پر سجدے میں گری ہوئی ہیں اور بڑے خضوع و خشوع سے کہہ رہی ہیں)

ماں : بارِ الٰہا! مجھے ہمت دے۔ مجھے صبر دے۔ میں ایک ماں عاجزی کے آنسو لے کر تیری بارگاہ میں آتی ہوں۔ میرے آقا! یہ میری زندگی کے نازک ترین لمحے ہیں۔ میرا لال، میرا لختِ جگر توپ کے منہ پر بندھا ہے۔ میرا بچہ، میرا، میرے دل کا ٹکڑا!

میرے اللہ! میرے پاک پروردگار۔ کہیں میں حوصلہ نہ ہار جاؤں! کہیں چیخوں سے میری چھاتی نہ پھٹ جائے۔ بارِ الٰہا! مجھے وہ صبر دے جو تُو نے حضرت اسمٰعیل کی ماں کو دیا تھا۔ میرے اللہ! مجھے ایک مجاہد، ایک غازی کی ماں بننے کی توفیق دے۔ میرے ہونٹوں سے کوئی شکایت کا لفظ نہ نکلے۔

(موسیقی ماں کی گریہ وزاری کے ساتھ ساتھ جاری رہتی ہے)

(صبح کا سماں اور صوتی اثرات جن سے طلوعِ صبح کی نشاندہی ہو

دُور اچانک توپ چلنے کی آواز)

ماں : شکر ہے بارِ الٰہا! میرا بیٹا توپ کے پنجرے سے آزاد پنچھی کی طرح رہا ہو گیا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنے پیارے وطن میں جگہ جگہ بکھر گیا ہے۔

باری تعالےٰ! جہاں جہاں میرے بچے کا لہو گرا ہے، جس جس جگہ میرے لال کے جسم کا ٹکڑا پہنچا ہے، وہاں ایسے مجاہد پیدا کر جو ایک بار پھر آزادی کی جنگ لڑیں، جو ان کافر فرنگیوں کو اس سرزمین سے ہمیشہ کے لیے نکال دیں۔ جو وطن کی آزادی کا پرچم نیلے آسمانوں کی بلندیوں پہ پہنچا دیں۔ اس پرچم کا سایہ ہر مقام پہ، ہر شہر، ہر گاؤں پر چھا جائے۔ بارِ الٰہا۔ باری تعالیٰ!!

ذوق و شوق

علامہ اقبال کی نظم "ذوق و شوق" پر مبنی ایک کھیل

کردار:-

دشت گرد ——————

پہلا مسافر ——————

دوسرا مسافر ——————

ایک عورت ——————

راحیل ...... — عورت کا بیٹا

O

منظر:۔ مدینے کے قرب و جوار میں ایک دشت۔ دوپہر کا وقت۔ روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی۔ سامنے ایک شاداب گوشہ۔ گھاس اُگی ہوئی۔

جس وقت پردہ اُٹھتا ہے دشت نورد، ایک مسافر کو جو نیم بے ہوش ہے۔ اپنے بازوں پر اُٹھائے ایک طرف سے اس گوشے کی طرف آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دشت گرد تنومند آدمی ہے۔ لباس پاجامہ، مبارزتہ اور دونوں شانوں پر ایک سفید چادر۔ چہرے پر دشت گردی کی وجہ سے سیاہی بکھری ہوئی۔ ویسے ایک اندرونی ذوق و شوق سے آنکھوں میں ایک خاص چمک۔

دشت گرد شاداب گوشے میں پہنچ کر مسافر کو جسے آئندہ پہلا مسافر کہا جائیگا، گھاس پر لٹا دیتا ہے، شانوں سے چادر اُتار کر اس کا گرد آلود چہرہ صاف کر دیتا ہے۔ اور اس کے چہرے پر جھک کر بڑی ملائمت سے بولتا ہے۔

دشت گرد: مسافر! میرے بھائی!

مسافر: (آنکھیں کھول کر) کون ہو تم!

دشت گرد: ایک دشت گرد۔ یہی میرا نام ہے۔

مسافر: (بیٹھ کر اور گھبراہٹ میں ادھر اُدھر دیکھ کر) وہ کہاں گئے۔ وہ لوگ؟

دشت گرد: وہ کون؟

مسافر: قافلے والے۔ کدھر ہیں؟

دشت گرد: میں نے تمہارے قافلے والوں کو نہیں دیکھا۔ صرف تمہیں دیکھا۔ تم ایک ٹیلے کے پاس بے ہوش پڑے تھے اور تمہارا جسم گرد و غبار میں دب گیا تھا۔ صرف تمہارا بازو ننگا تھا۔

مسافر : او میرے اللہ۔

دشت گرد: کیا بیتی ہے تم پر میرے بھائی؟

مسافر : میں قافلے کے ساتھ جارہا تھا۔ زبردست آندھی چلی۔ ہم سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ کون کہاں ہے۔ کہاں چلا گیا ہے؟

دشت گرد: وہ لوگ کدھر چلے گئے؟

مسافر : میں نہیں جانتا۔ اور تو کچھ نہ سوجھ سکا مگر آندھی کے خوفناک تھپیڑوں نے میرا راستہ روک دیا۔ گرد و غبار میری آنکھوں کے اندر چلا گیا۔ میرا حلق بند ہو گیا۔ ساتھیوں کو پکار بھی نہ سکا۔ تیورا کر گر پڑا۔ سمجھ لیا میری آخری گھڑی آگئی ہے۔

دشت گرد: خدا نہ کرے۔

مسافر : سمجھ میں نہیں آتا میں زندہ کیسے رہا؟

دشت گرد: وہ جس نے مجھے، تمہیں اور سارے انسانوں کو پیدا کیا ہے، وہ ہر شے پہ قادر ہے۔ وہ جسے زندہ رکھنا چاہے اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔

مسافر : اوہ۔

دشت گرد: کیا ہوا؟

مسافر : حلق کے اندر کانٹے چبھ رہے ہیں۔ پیاس سے سینے کے اندر آگ سی لگی ہے

دشت گرد: چھاگل ہے میرے پاس پہ ہو سکتا ہے اس میں تھوڑا سا پانی ہو۔

کُرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر چھاگل نکالتا ہے۔ اسے کھولتا ہے اور مسافر کے ہونٹوں سے لگا دیتا ہے)

مسافر بے تابی سے چھاگل اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے اور اسے منہ میں اُلٹ دیتا ہے)

مسافر : کچھ نہیں۔ ایک قطرہ نہیں۔

دشت گرد: اس مسافر نے سارا پانی پی لیا تھا۔ سخت پیاسا تھا۔

مسافر : خودغرض۔ لالچی۔

دشت گرد: ایسا نہ کہو میرے بھائی! بہت زیادہ پیاسا تھا۔ اس کی جگہ تم ہوتے تو یہی حرکت کرتے۔

مسافر: مَیں پیاسا مر جاؤں گا۔

دشت گرد: نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ اپنے خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔

مسافر: چھاگل میں ایک قطرہ بھی نہیں۔ میرے۔ اندر۔ آگ بھڑک۔ رہی ہے۔

دشت گرد: مَیں پانی لاؤں گا۔ تمہارے آنے سے پہلے ادھر میں نے ایک قافلے کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک چھاگل ضرور مل جائے گی۔ مایوس نہ ہو۔ پانی ضرور لاؤنگا۔

(دشت گرد مغرب کی طرف جاکر سٹیج سے باہر نکل جاتا ہے۔ مسافر سر جھکائے بیٹھا ہے۔ اس کے بیٹھنے کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی تکلیف سے بیقرار ہے۔ خالی چھاگل اس کے سامنے گھاس کے اوپر پڑی ہے۔ مشرق کی طرف سے ایک اور مسافر آتا ہے۔ خراب وخستہ حال۔ چہرہ گرد آلود، کرتہ پھٹا ہوا۔ پیشانی پر ایک داغ جس سے لہو رس رہا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاکر شاداب گوشے کی طرف آرہا ہے۔

پہلا مسافر دور خلا میں گھور رہا ہے۔ اسے دوسرے مسافر کے آنے کی خبر نہیں ہے۔

دوسرا مسافر وہاں چھاگل دیکھتا ہے تو اس کی رفتار میں تیزی آجاتی ہے۔ لڑکھڑاتا ہوا اس گوشے میں پہنچ جاتا ہے اور دھم سے گِر کر چھاگل کا منہ اپنے ہونٹوں سے لگالیتا ہے۔

پہلے مسافر کو اس کے آنے کی اب خبر ہوتی ہے۔ مُرکھا سا قہقہہ لگاتا ہے)

پہلا مسافر: کچھ نہیں۔ ایک بوند نہیں۔

دوسرا مسافر: ہائے۔ مر گیا۔

پہلا مسافر: پانی پیو گے؟

(دوسرا مسافر منہ سے کچھ کہنے کی بجائے اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتا ہے)

مگر صبر کرو۔

دوسرا مسافر: بڑے ظالم ہو۔

پہلا مسافر (احتجاجاً دایاں ہاتھ بلند کرتے ہوئے) نہیں۔ مَیں نے ایک قطرہ تک

نہیں پیا۔ جب آیا۔ چھاگل خالی تھی۔

دوسرا مسافر: پانی کہاں گیا؟

پہلا مسافر: کوئی اور پی گیا۔ جو ہماری ہی طرح پیاسا تھا۔ سارا پانی پی گیا۔

(دوسرا مسافر غصے سے چھاگل پرے پھینک دیتا ہے۔)

دوسرا مسافر: بالکل بے کار شے۔

پہلا مسافر: صبر کرو۔ پانی مل جائے گا۔ وہ پانی ہی لینے گیا ہوا ہے۔

دوسرا مسافر: کون؟

پہلا مسافر: ایک نیک آدمی۔ میرا دل کہتا ہے وہ پانی سے بھری ہوئی چھاگل ضرور لے آئے گا۔

دوسرا مسافر: کب؟

پہلا مسافر: یہ کون۔ جانے! تم بھی آندھی کے ستائے ہوئے ہو۔

دوسرا مسافر: نہیں۔ آندھی چلنے سے پہلے ڈاکوؤں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میں نے مقابلہ کیا۔ پر اُن کے پاس ہتھیار تھے۔ سب کچھ چھین کر لے گئے۔

پہلا مسافر: اوہو۔

دوسرا مسافر: وہ۔ کب آئے گا؟

پہلا مسافر: میں نہیں جانتا۔ پر آئے گا ضرور۔

دوسرا مسافر: جب میں مر جاؤں گا۔

پہلا مسافر: تم سے زیادہ پیاس مجھے لگی ہے۔ میرے اندر ریت اور مٹی جم گئی ہے۔ میرے حلق میں کانٹے چُبھ رہے ہیں۔

دوسرا مسافر: تم نے کیوں اسے سارا پانی پینے دیا۔ وہ بڑا۔ خودغرض انسان تھا۔

پہلا مسافر: خودغرض (قہقہہ مارنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) کون۔ خودغرض۔ میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ میرے آنے سے پہلے آیا تھا۔

دوسرا مسافر: ہائے آگ۔ (دوسرا مسافر چھاتی پر زور سے دوہتڑ مارتا ہے)

پہلا مسافر: آگ میرے سینے میں بھی ہے۔ جو میرا لہو۔ جلا رہی ہے۔ پر وہ

آنسئے گا۔ وہ سچا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سلوک بڑا اچھا تھا۔ اس نے بڑی ہمدردی سے میرا چہرہ صاف کیا تھا۔ سنو۔

(پہلا مسافر ایک طرف کان لگا دیتا ہے)

پہلا مسافر: گھنٹیوں کی آواز۔ کوئی قافلہ جا رہا ہے۔

دوسرا مسافر: قافلے آتے جاتے رہتے ہیں۔

پہلا مسافر: قافلے والوں کے پاس پانی سے بھری ہوئی چھاگلیں ہوتی ہیں کھجوریں ہوتی ہیں۔ کیا کچھ نہیں ہوتا۔

دوسرا مسافر: یہ سب کچھ ان کے اپنے لیے ہوتا ہے۔

پہلا مسافر: ہمارے پاس بھی سب کچھ تھا۔ یہ میرے اندر نشتر سے کیا چُبھ رہے ہیں؟

دوسرا مسافر: میرے اندر کانٹے ہیں۔ زہریلے، خونخوار اور باہر بھی کانٹے ہیں۔ پاؤں میں ——

(جھک کر اپنا دایاں پاؤں دیکھتا ہے)

انہوں نے مجھے بار بار دھکا دیا۔ گرم ریت کے اُوپر۔ نوکدار کانٹوں کے اُوپر۔ اگر میں چل سکتا تو اُدھر جاتا۔ اپنی منزل کی طرف۔

پہلا مسافر: میرا بھی بہت بُرا حال ہے۔

(ایک عورت آتی ہے۔ ادھیڑ عمر کی۔ قمیص، شلوار اور چادر میں ملبوس، چہرے پر پریشانی برس رہی ہے)

دونوں اس طرف دیکھ رہے ہیں جدھر سے قافلے کی گھنٹیوں کی آواز آ رہی ہے۔ وہ عورت کی آمد سے بے خبر ہیں۔

(عورت انھیں دیکھ کر آگے بڑھتی ہے اور شاداب گوشے میں پہنچ جاتی ہے)

عورت: تم لوگوں نے ——

(پہلا مسافر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر دوسرا بھی اپنا رُخ اُدھر پھیر لیتا ہے

پہلا مسافر: کیا ہے؟

عورت : میرا بیٹا۔

دوسرا مسافر: کیا ہوا تمہارے بیٹے کو؟

عورت : وہ ایک قافلے میں تھا۔ لمبا جوان۔ آنکھیں نیلے رنگ کی۔ اس کے گلے میں سُرخ رومال تھا۔

پہلا مسافر: وہ تمہارا بیٹا ہے!

عورت : کہاں دیکھا ہے تم نے۔ (بڑی بے تابی سے) کہاں ہے وہ؟

پہلا مسافر: مَیں نہیں جانتا۔

عورت : (جھک کر) بیٹے! بتاؤ نا وہ کہاں ہے۔ وہ میری زندگی کا تنہا سہارا ہے۔ مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا قافلے کے ساتھ۔

پہلا مسافر: تم اس کی تلاش میں آئی ہو؟

عورت : ہاں۔ ماں جو ہوئی۔ ایک بدقسمت ماں۔

پہلا مسافر: ماں! دیکھتی ہو یہ دشت کتنا وسیع ہے۔ اس کی ریت میں ایک نہیں سینکڑوں بیٹے سما سکتے ہیں۔

عورت : (پہلے مسافر کا ہاتھ پکڑ کر) خدا کے لیے۔ تم بھی ایک بیٹے ہو تم بھی۔

دوسرا مسافر: (بیزار ہو کر عورت سے مخاطب ہو کر) کیا شور مچا رہی ہو۔ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑے ہیں۔

عورت : میری جان پر بھی آبنی ہے۔

پہلا مسافر: ماں! دشت میں ریت بہت زیادہ ہے اور جب ہوا اسے اُڑاتی ہے تو چاروں طرف سیاہ پہاڑ ناچنے لگتے ہیں۔ جو بھی ان کی زد میں آتا ہے وہ گرم ذروں کے انبار میں دب جاتا ہے۔ مَیں نے اُسے اس وقت دیکھا تھا جب قافلہ بڑے مزے سے سفر کر رہا تھا۔ ہمارے اُونٹوں کے گلے سے بندھی ہوئی گھنٹیاں گونج رہی تھیں۔ پھر جب کالی آندھی چلی تو کسی کو بھی کسی کا ہوش نہ رہا۔ اگر تمہارا بیٹا ریت

میں دب کر مر نہیں گیا تو وہ کہیں میری طرح گھاس پر بیٹھ کر پیاس کی شدت سے تڑپ رہا ہو گا۔

عورت : میں تھک چکی ہوں ۔ میری رگ رگ میں درد ہو رہا ہے ۔ کہاں ڈھونڈوں اسے ؟

(عورت جانے لگتی ہے اور کچھ دُور جا کر رُک جاتی ہے ۔ اس نے شب گرد کو آتے ہوئے دیکھ لیا ہے)

دوسرا مسافر : وہ ابھی آیا کیوں نہیں ۔

پہلا مسافر : آ جائے گا ۔

(دوسرا مسافر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی کا لہو صاف کرتا ہے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے آنکھیں ملتا ہے ۔

شب گرد ہاتھ میں ایک بڑی چھاگل اور ایک پوٹلی لے کر آتا ہوا نظر آتا ہے)

دیکھو وہ آ گیا ہے ۔

دونوں مسافر اُٹھ بیٹھتے ہیں ۔ بڑی مشکل سے شب گرد کی طرف دو تین قدم چلتے ہیں ۔ عورت اپنی جگہ کھڑی رہتی ہے ۔

شب گرد دونوں مسافروں کے پاس تیزی سے آ جاتا ہے ۔ مسافر اپنے ہاتھ شب گرد کی طرف بڑھا کر چھاگل چھین لینا چاہتے ہیں ۔

شب گرد کی نظر عورت پر نہیں بڑی جو تکٹکی باندھ کر یہ منظر دیکھ رہی ہے ۔

شب گرد چھاگل والا ہاتھ اُوپر اُٹھاتا ہے)

شب گرد : صبر ۔ ذرا صبر ۔ یہ پانی تمہارے ہی لیے ہیں ۔

(دوسرے مسافر کا ہاتھ چھاگل پر پہنچ جاتا ہے ۔ شب گرد اُس کا ہاتھ چھاگل سے ہٹا دیتا ہے)

شب گرد : پہلا حق (پہلے مسافر کی طرف پوٹلی والا ہاتھ اُٹھا کر) اس کا ہے ۔ یہ پہلے آیا تھا ۔

دوسرا مسافر: میں مر رہا ہوں۔

شب گرد: بس دو تین لمحے اور۔

(شب گرد چھاگل کا منہ پہلے مسافر کے ہونٹوں سے لگا دیتا ہے۔ مسافر اپنے دونوں ہاتھ شب گرد کے ہاتھوں پر رکھ دیتا ہے)

شب گرد: میرے عزیز بھائی! آہستہ آہستہ۔

(پہلا مسافر غٹا غٹ کئی گھونٹ پی جاتا ہے۔)

شب گرد: اب چھوڑ دو۔

(شب گرد اب چھاگل دوسرے مسافر کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے۔ دوسرا مسافر بے صبری میں پانی کا ایک حصّہ اپنے کُرتے پر بہا دیتا ہے)

شب گرد: بے صبرے مت ہو۔ اتنا پانی ہے کہ تمہاری پیاس بجھ جائے گی۔

(دوسرا مسافر پانی پی کر لمبا سانس لیتا ہے)

شب گرد: (دونوں مسافروں سے) پیاس بجھ گئی؟

(دونوں مسافر اثبات میں سر ہلاتے ہیں)

شب گرد: الحمدللہ۔

(شب گرد چھاگل کا منہ اپنے ہونٹوں سے لگانے لگتا ہے کہ پہلی بار اُس کی نظر عورت پر پڑتی ہے)

شب گرد: وہ کون ہے؟

پہلا مسافر: ایک ماں جو اپنا بیٹا ڈھونڈ رہی ہے۔

(شب گرد چھاگل اپنے ہونٹوں سے ہٹا دیتا ہے اور عورت کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ مسافر بھی اس کے پیچھے پیچھے بہ مشکل قدم اُٹھانے لگتے ہیں۔)

شب گرد: بہن! تُو بھی پیاسی ہوگی؟

عورت: ہاں۔

(شب گرد چھاگل اس کی طرف بڑھاتا ہے)

شب گرد : یہ۔ پی لے پانی۔

عورت : (ہاتھ نفی میں ہلاتے ہوئے) نہیں۔

شب گرد : کیوں نہیں؟

عورت : وہ۔ پیاسا ہوگا۔

شب گرد : تمہارا بیٹا؟

(دونوں مسافر اُن کے قریب پہنچ چکے ہیں)

عورت : وہ پیاسا ہے اور میں پانی پیوں؟

شب گرد : اس کے لیے دینے والا اور پانی دے دے گا۔

عورت : (اپنے خیال میں، نہ جانے کہاں پھر رہا ہے۔ کیا بیتی ہے اس پر۔ آندھی نے اس کا کیا حال کیا ہے۔ کہیں وہ اس قافلے میں تو نہیں تھا جس پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا ہے۔ کون جانے؟

شب گرد : جاننے والا جانتا ہے۔

(شب گرد چھاگل اُس کی طرف بڑھاتا ہے)

عورت : (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) نہیں۔

پہلا مسافر : بابا! تم کیوں نہیں پی لیتے؟

شب گرد : مجھے پیاس مغلوب نہیں کر سکتی۔ میں پیاس پر غالب آسکتا ہوں۔

دوسرا مسافر : بابا! تم فرشتوں کی سی باتیں کرتے ہو۔

شب گرد : انسان فرشتوں سے بلند ہوتا ہے میرے بھائی!

پہلا مسافر : (مغرب کی طرف دیکھ کر) آثار پھر ویسے کے ویسے ہیں۔ آندھی دوبارہ نہ آجائے۔

شب گرد : جس اللہ نے تمہیں اس آندھی میں زندہ رکھا ہے۔ اس آندھی میں بھی زندہ رکھے گا۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ وہ بڑی رحمتوں والا پروردگار ہے۔

عورت : میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں۔ نہیں ملا میرا بچہ۔ اس کی رحمت۔

شب گرد : اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے) اس کی رحمت سے مایوس مت ہو۔
تمہارا بیٹا اس دشت کی وسعتوں میں کہیں سرگرمِ سفر ہوگا۔ مل جائے گا۔

عورت : مل جائے گا۔ ایک قافلہ آندھی میں بکھر گیا، تنکوں کی طرح۔

دوسرا مسافر : اور ایک قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کر کے اس کا سب کچھ لوٹ لیا۔

شب گرد : (دونوں مسافروں سے) تم زندہ ہو!

پہلا مسافر : ہاں۔

شب گرد : خدا کا شکر ادا کرو۔

عورت : میں اُس وقت شکر ادا کروں گی جب میرا بیٹا مجھے مل جائے گا۔

شب گرد : خدا پر بھروسہ رکھو وہ بچھڑے ہوؤں کو ملا دیتا ہے۔ اس کے لیے کوئی کام غیر ممکن نہیں ہے۔

عورت : تو میں کیا کروں؟

شب گرد : خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ پی لو پانی۔

(شب گرد چھاگل اُس کی طرف بڑھاتا ہے)

عورت : وہ پیاسا ہے۔

پہلا مسافر : بابا! عجیب آدمی ہو تم۔ کیوں بار بار کہہ رہے ہو اسے۔ نہیں پیتی تو نہ پیے۔ تم کیوں پیاسے رہو؟

دوسرا مسافر : جب کہ پانی تم لے کر آئے ہو۔

شب گرد : دینے والے نے دیا ہے۔

پہلا مسافر : تو پی لو۔

شب گرد : ایک پیاسا انسان پاس کھڑا ہو اور میں چھاگل ہونٹوں سے لگا لوں؟ دینے والے نے پانی مجھے اس غرض کے لیے تو نہیں دیا تھا۔

(شب گرد چھاگل گھاس پر ایک طرف رکھ دیتا ہے)

ہم انتظار کریں گے۔

پہلا مسافر: وہ نہ آیا تو؟

عورت : روک اپنی زبان، منحوس کہیں کا۔ تُو ایک ماں کا دُکھ نہیں جانتا۔

پہلا مسافر: کیا بیٹا بیٹا کی رٹ لگا رکھی ہے۔

عورت : تمہیں کیا؟

شب گرد: (انھیں خاموش کرنے کے لیے ہاتھ بلند کرتے ہوئے) لڑو مت۔ تلخ باتیں کیوں نکالتے ہو منہ سے۔ ہر شخص کا اپنا دُکھ اپنا ہوتا ہے مگر ہر انسان کا دُکھ سارے انسانوں کا دُکھ ہوتا ہے (عورت کی طرف اشارہ کر کے) اس کا دُکھ زیادہ ہے۔

پہلا مسافر: تو ہم کیا کریں؟

شب گرد: اس کے بیٹے کو ڈھونڈو۔ جو بچھڑ گیا ہے اسے ڈھونڈو۔ مل جائے گا۔ جاؤ۔ میں بھی ڈھونڈوں گا۔

پہلا مسافر: دشت بہت وسیع ہے۔

شب گرد: انسانی ہمت کے آگے ساری وسعتیں سمٹ جاتی ہیں۔ کوئی وسعت رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ لگا رہے دمادم ہیں زندگی ہے۔

(شب گرد چھاگل اٹھا کر عورت کے ہاتھ میں دینے لگتا ہے)

شب گرد: اپنے پاس رکھ بہن۔ ہم اُسے ڈھونڈیں گے۔

(عورت چھاگل لے لیتی ہے۔ پردہ جب گرنے لگتا ہے تو یہ چاروں مغرب کی طرف جانے لگتے ہیں۔

چند لمحوں کے بعد دوبارہ پردہ اٹھتا ہے۔ اب اسٹیج پر ایک تو وقت کی تبدیلی ہو چکی ہے۔ صبح کا وقت۔ سورج ابھی ابھی طلوع ہوا ہے۔

کرداروں میں راحیل کا اضافہ ہو گیا ہے۔ راحیل عورت کا بیٹا ہے۔

دونوں مسافر، عورت اور راحیل گھاس کے اوپر بیٹھے رومال میں پڑی ہوئی کھجوریں کھا رہے ہیں۔ ایک طرف گٹھلیوں کا ڈھیر نظر آ رہا ہے۔

شب گرد ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا مشرق کی سمت دیکھ رہا ہے۔ یوں لگتا

ہے وہ مسلسل ادھر دیکھ رہا ہے۔

عورت اپنی جگہ سے اُٹھتی ہے اور شب گرد کے پاس آکر رُک جاتی ہے۔

شب گرد اُسی طرف دیکھ رہا ہے)

عورت : بابا! تمہارا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔

شب گرد : (بدستور اُدھر دیکھتے ہوئے) شکریے کی ضرورت نہیں۔

عورت : تم نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔

شب گرد : (اس کی طرف دیکھ کر) نہیں بہن! ایسی کوئی بات نہیں۔

(دونوں مسافر اور راحیل بھی ادھر آجاتے ہیں)

پہلا مسافر : بابا! تمہارا حقہ۔ وہیں پڑا ہے۔

شب گرد : کسی کو بھوک پیاس تو نہیں؟

پہلا مسافر : نہیں۔

(شب گرد دوسرے مسافر اور راحیل پر نظریں ڈالتا ہے)

راحیل : (پہلے مسافر کی طرف اشارہ کرکے) یہ ٹھیک کہتا ہے۔

شب گرد : تو تم لوگ جاؤ۔ آندھی میں جو لوگ بکھر گئے تھے وہ یقیناً کہیں جمع ہو کر سفر کرنے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ جن لوگوں پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا وہ بھی اپنی منزل کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔ اور بہن! تمہارا بیٹا تمہارے ساتھ جانے کے لیے آمادہ ہے۔ (سب خاموش رہتے ہیں)

کیا سوچ رہے ہو۔

پہلا مسافر : آپ کو چھوڑتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے۔

شب گرد : ہماری ملاقات اتفاقی طور پر ہو گئی تھی۔ ہماری منزلیں الگ الگ ہیں۔ اور میں تو اپنی منزل پہ ہوں۔ تم لوگوں کو الگ الگ نزدیک و دُور رہنا ہے)

دوسرا مسافر : ہاں ہماری منزلیں الگ الگ ہیں۔

(شب گرد توجہ سے مغرب کی جانب دیکھتا ہے)

شب گرد: فضائے دشت میں بانگِ رحیل گونجنے لگی ہے۔ کوئی قافلہ جانے والا ہے۔

دوسرا مسافر: ہو سکتا ہے یہ میرا قافلہ ہو۔

پہلا مسافر: ممکن ہے میرا ہو۔

شب گرد: قافلے گزرتے رہتے ہیں کتنے ہی کارواں یہاں سے گزر چکے ہیں اِدھر آگ بجھی ہوئی ہے۔ اُدھر ایک طناب ٹوٹی ہوئی پڑی ہے۔ اب بھی کارواں جا رہے ہیں۔ آئندہ بھی آتے جاتے رہیں گے جو اپنے قافلے سے پیچھے رہ جائے قصور اُس کا ہے۔ قافلے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ کسی کی خاطر اپنا سفر روک لے۔ قافلے کسی کی خاطر نہیں ٹھہرتے۔

دوسرا مسافر: ٹھیک ہے۔

دونوں مسافر مغرب کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔

عورت: بابا!

راحیل: بابا! تم نہیں جاؤ گے۔

عورت: کیا تمہارا کوئی قافلہ نہیں ہے۔ تم کسی قافلے کی راہ نہیں دیکھ رہے۔ تم کسی قافلے سے نہیں بچھڑے، تم کون ہو بابا؟

شب گرد: میں وہ ہوں جس کی رگ رگ میں ذوق و شوق کا طوفان موجزن ہے۔ چلنا اور چلتے رہنا میری زندگی ہے۔ بادِ صرصر کے جھونکے میری راہ نہیں روک سکتے۔ دشت کے نوکیلے خار میری رفتار میں حائل نہیں ہیں۔ دھوپ کی آگ میری روح تک نہیں پہنچی۔ یہ ننگا پن، یہ دوام میرے لیے زندگی کی دلیل ہے۔

راحیل: بابا! اس دشت میں کیا ہے؟

شب گرد: اس دشت میں کیا نہیں ہے۔ یہاں صبح کا اجالا میرے قلب و نظر کو ایک نیا ذوقِ حیات بخشتا ہے۔ یہاں چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں بہتی ہیں۔ یہاں حسنِ ازل کے جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ یہ جو میرے اندر تب و تابِ جاوداں ہے ہر لمحہ مجھے نئی زندگی دیتا ہے۔

راحیل: نئی زندگی! دہاں سے، بابا! کیا کہتا ہے؟

عورت: تم نہیں سمجھ سکتے۔

راحیل : تم سمجھ گئی ہو تو بتاؤ۔

عورت : میں بھی نہیں سمجھ سکی۔ (شب گرد مشرق کی طرف دیکھ رہا ہے)

شب گرد : رات جو اس طرف سرخ و کبود بدلیاں تیر رہی تھیں وہ کوہِ عجم کی بلندیوں پر زنگار رنگ چادریں بن گئی ہیں۔ ہوا کتنی صاف ہے۔ درخت گرد و غبار سے دُھل گئے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے جیسے اُدھر کاظم کی ریت مخمل کی طرح نرم اور ملائم ہو گئی ہے۔ کاظم میرا حریمِ قلب میری آرزوؤں کا گہوارہ جس کے ذرّے ذرّے میں میرا دل دھڑک رہا ہے۔ کاظم ——

(دشت گرد کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ ماں اور بیٹا دونوں اسے حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں)

راحیل : امی ! آؤ۔

عورت : دیکھ رہی ہوں۔

شب گرد : (اپنے دھیان میں) ریت کے یہ ذرّے کتنے روشن ہیں۔ ان فضاؤں میں میرے حضورؐ کی آوازیں گونجی تھیں۔ ان ہواؤں میں میرے حضورؐ کی خوشبوئیں بکھر چکی ہیں۔

عورت : حضورؐ ؟

شب گرد : میرے حضورؐ کا جلال شوکت سنجر و سلیم میرے حضورؐ کا جمال فقر جنید و بایزید (پہلا مسافر ادھر آ جاتا ہے)

میرے حضورؐ ہی سے میرے سینے میں سوز و گداز ہے۔

عورت : وہ حضورؐ۔ ہمارے حضورؐ (عورت کی آنکھوں سے بھی آنسو نکلنے لگتے ہیں)

شب گرد : میری روح کی حرارت۔

عورت : ہماری روح کی حرارت۔ (دوسرا مسافر بھی آ جاتا ہے)

شب گرد : میرے آنسوؤں کی روشنی۔

عورت : ہمارے آنسوؤں کی روشنی۔

شب گرد : (بلند آواز) لبیک یا نبی مکرمؐ۔ لبیک یا نبی مکرمؐ)۔

عورت : لبیک یا نبی محترمؐ۔

شب گرد : لبیک لبیک۔ (ایک طرف چلنے لگتا ہے۔ عورت اسکا بیٹا۔ اور دونوں مسافر بھی چلنے لگتے ہیں)

سب : لبیک لبیک لبیک۔ (شب گرد کے پیچھے سب قدم اٹھاتے ہیں اور پردہ گرتا ہے)

مسجدِ قرطبہ

علامہ اقبالؒ کی نظم "مسجدِ قرطبہ" کی بنیاد پر لکھا ہوا کھیل

کردار:-

امیر عبدالرحمن الداخل ——— والئ اندلس
بدر ——— امیر کا معتمد ساتھی
پادری ———
ناصر ——— امیر کا غلام
سلیمان ——— امیر کا بیٹا
عبداللہ ——— امیر کا بیٹا
ہشام ——— امیر کا بیٹا
یوسف ——— ہشام کا ایک معتمد
والدہ ہشام ———

حکم ——— امیرِ اندلس
محمد بن عامر منصور ——— امیرِ اندلس
منذر ——— امیر اندلس کا معتمد
ابوعبداللہ ——— غرناطہ کا آخری حکمران
ماں ——— ابوعبداللہ کی ماں
عارف بن زید ——— مسجدِ قرطبہ کا موذن
لاٹ پادری ———
ایک سیاح ———
گائیڈ ———

ان کے علاوہ

علامہ اقبالؒ کی آواز

○

مدھم موسیقی جو چند لمحے جاری رہتی ہے۔ ۵۹، ۶ کا قرطبہ۔

امیر عبدالرحمٰن الداخل محل کے ایک کمرے میں موم بتی کی روشنی میں چٹائی کے اُوپر بیٹھا دعا مانگ رہا ہے۔

امیر عبدالرحمٰن: اے خدائے رحمٰن و رحیم! میں کس زبان سے تیرے بے پایاں احسانات کا شکریہ ادا کروں؟ میرے پاس الفاظ ہیں اور نہ زبان کو تابِ گویائی ہے۔ اگر تیری رحمت قبول کرے تو یہ میرے آنسو حاضر ہیں جو میرے دل کی گہرائیوں سے نکل رہے ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر! موت نے میرا قدم قدم پر پیچھا کیا ہے۔ اور تُو نے قدم قدم پر مجھے اپنی حفاظت کی چادر میں لپیٹ لیا ہے۔ اگر تیرا فضل میرا شریکِ حال نہ ہوتا تو آج ہشام کا یہ پوتا — یہ تیرا عاجز بندہ عبدالرحمٰن گمنامی کی موت مر چکا ہوتا اور میرا کوئی نام لینے والا بھی اس دُنیا میں نہ ہوتا۔

مولا کریم! بڑھاپا دبے پاؤں میری جانب آرہا ہے اور میں تیرا کمزور و ضعیف بندہ جس کی بے حرمتی عباسیوں کے ہزاروں نیزے بھی نہ کر سکے۔ موت کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ تیری بارگاہ میں میری التجا ہے کہ مجھے کوئی ایسا کام کرنے کی توفیق دے، جس سے اسلام کی عظمت میں اضافہ ہو اور میرا عمل ایک مردِ خُدا کا عمل بن جائے۔ میرے سینے میں عشق کی آگ شعلہ ریز ہو اور اس سے ایسی روشنی پھُوٹے جو کائنات کی وسعتوں پر ہمیشہ پھیلتی رہے۔

اے پاک پروردگار! اے پاک پروردگار!

سسکیاں۔ جب یہ سسکیاں تھم جاتی ہیں تو بدر کی آواز ذرا دُور سے آتی ہے۔

بدر : آقا!

عبدالرحمٰن : بدر! آجاؤ۔

بدر : آقا میں معافی کا خواستگار ہوں کہ آپ نے شام کو حاضر ہونے کے لیے کہا تھا۔ میں بھول گیا۔ سوچا آپ صبح کی نماز کے لیے بیدار ہو گئے ہیں۔ پیشِ خدمت ہو کر معافی مانگ لوں۔

عبدالرحمٰن : معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے بہت مناسب وقت پر آئے ہو بدر!

بدر : جی امیر۔

عبدالرحمٰن : نمازِ صبح سے پہلے تنہائی کے لمحوں میں مجھے اپنا ماضی یاد آجاتا ہے اور جب اپنے آپ کو زندہ پاتا ہوں تو مجھے اپنی زندگی ایک زندہ معجزہ معلوم ہوتی ہے۔

بدر : آپ کی زندگی واقعی ایک زندہ معجزہ ہے۔ دشمنوں نے تو آپ کو نیزے میں پرو لیا ہوتا۔

عبدالرحمٰن : اگر اللہ میری حفاظت نہ کرتا تو۔

بدر : جی ہاں۔

عبدالرحمٰن : اور یہ بھی اسی بندہ نوازی ہے کہ میں اِس ملک میں بالکل ایک اجنبی کی حیثیت سے آیا تھا اور آج اِس ملک کا والی ہوں۔

بدر : یا امیر! آج اندلس کا ہر شخص تہِ دل سے آپ کا احترام کرتا ہے کہ آپ نے اس کے ملک کو ایک جنت بنا دیا ہے۔

عبدالرحمٰن : تمہیں یاد ہے بدر!

بدر : کیا بات یا امیر!

عبدالرحمٰن : جب میں یہاں رصافہ میں کھجور کا پودا لگا رہا تھا تو میرے ہونٹوں سے شعر اور میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ جانتے ہو کیوں؟ یہ خوشی کے آنسو تھے بدر! میں محسوس کر رہا تھا کہ اللہ نے اس اجنبی سرزمین میں خرما کے پودے کو میرا ساتھی بنا دیا ہے۔ ہم یہاں دونوں اجنبی ہیں۔ مگر دونوں ایک

دوسرے کے ساتھی ہیں۔

بدر : رصافہ آج آپ کے دادا کے باغ کی طرح ایک بہت وسیع اور شاداب باغ بن چکا ہے۔ جس کے طرح طرح کے پودے اجنبی ہواؤں میں اپنی خوشبوئیں بکھیر رہے ہیں۔

عبدالرحمٰن : بدر تم کب آئے تھے؟

بدر : یا امیر اسے میری گستاخی نہ سمجھئے میں نے آپ کی دُعا کے الفاظ سُن لیے ہیں۔

عبدالرحمٰن : میں تو خود تمہیں اپنی دُعا کے یہ الفاظ سُنانا چاہتا تھا۔ اچھا ہوا تم نے خود ہی یہ سب کچھ سُن لیا ہے بدر! تمہیں علم ہے، میری زندگی کا زیادہ حصہ جنگ و جدل اور مسلسل جد و جہد میں بیتا ہے، جب سے یہاں آیا ہوں۔ اس ملک کی بہتری کی کوششوں میں مصروف ہوں۔

بدر : اور آپ کی کوششوں سے دارالحکومت قرطبہ خوشحالی میں اپنی مثال آپ بن گیا ہے۔ اور اُندلس کے جن علاقوں پر بھی آپ کا اقتدار قائم ہے، وہاں سے غربت اور بدنظمی دُور ہو گئی ہے۔

عبدالرحمٰن : بدر ہر روز سونے سے پہلے میں دن بھر کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا ہوں۔ اگر کسی رات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج خلقِ خدا کے لیے بیتنے ہوئے دن سے زیادہ کام نہیں کیا تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی میں ایسے دنوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جب میں نے محسوس کیا ہو کہ آج کا دن پچھلے دن کے مقابلے میں کمتر ہے۔

بدر : امیر مجھے تو آپ کی زندگی میں کوئی دن بھی ایسا نظر نہیں آیا جس میں آپ نے دوسرے دنوں سے کم نیکیاں کی ہوں۔

عبدالرحمٰن : تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟

بدر : امیر میں سائے کی طرح آپ کے ساتھ رہا ہوں۔

عبدالرحمٰن: اگر تمہارا یہ احساس میرا احساس بھی ہوتا تو میری روح میں وہ کرب نہ ہوتا جو میں کبھی کبھی بڑی شدت سے محسوس کرتا ہوں۔

بدر: کرب آپ کی روح میں! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں امیر؟

عبدالرحمٰن: میری روح کے اندر ایک بے چینی سی، ایک کرب سا ہر وقت رہتا ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ ابھی میں نے وہ کچھ نہیں کیا جو مجھے کرنا چاہیے جو میرا فرض ہے۔ جو میرا حقیقی کام ہے۔

بدر: آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟

عبدالرحمٰن: بدر! تم دیکھتے ہو دن طلوع ہوتا ہے تو روشنی پھیل جاتی ہے۔ پھر رات آتی ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہ سلسلۂ روز و شب نہ جانے کب سے جاری ہے۔ اس سلسلۂ روز و شب میں انسان اور انسان کے کارنامے مٹ جاتے ہیں۔ اس کائنات میں سب کچھ بے ثبات ہے۔ سب کچھ آنی و فانی ہے۔

بدر: جی ہاں سب کچھ بے ثبات ہے۔

عبدالرحمٰن: میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ بھی اس طویل سلسلۂ روز و شب میں فنا ہو جائے گا۔ یہ رصافہ، یہ میرا محل، یہ ٹکسال یہ ساری چیزیں ختم ہو جانے والی ہیں۔

بدر: آپ کیوں اس طرح سوچ رہے ہیں امیر؟

عبدالرحمٰن: یہ میری سوچ ہی میری روح کا کرب بن گئی ہے۔

بدر: تو آپ چاہتے کیا ہیں؟

عبدالرحمٰن: کوئی ایسا کارنامہ جو اس سلسلۂ روز و شب سے بے نیاز ہو ــــــ جس پر سے صدیوں کے کارواں چپ چاپ گزر جائیں ــــــ جو گردشِ شام و سحر کے درمیان زندہ رہے۔

بدر: جو موت کا مقابلہ کر سکے۔

عبدالرحمٰن: جس کے سامنے موت بھی بے دست و پا ہو جائے۔ میری آرزو ہے کہ میری روح کا سارا سوز و گداز، میرے آنسوؤں کی یہ ساری درخشندگی، میرے

خوابوں کی یہ ساری جگمگاہٹ کسی ٹھوس چیز میں جذب ہو کر اُسے لازوال بنا دے۔

بدر : آپ زندہ رہیں گے، آپ کے کارنامے تاریخ میں سنہری حرف میں لکھے جائیں گے۔

عبدالرحمٰن : انسان فانی ہے۔ یہ سب کارنامے فانی ہیں

بدر : تو وہ کونسا کارنامہ ہے۔ جو موت سے ماورا ہے۔ جس کو موت چھو نہیں سکتی؟

عبدالرحمٰن : اگر میں یہ بات جانتا تو میری رُوح تسکین پا چکی ہوتی۔

کسی قدر دور سے اذان کی آواز آتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی گفتگو رک جاتی ہے۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر

اشھد ان لا الہ الا اللہ

اشھد ان لا الہ الا اللہ

اشھد ان محمد الرسول اللہ

اشھد ان محمد الرسول اللہ

حی، علی الصلوٰۃ

حی، علی الصلوٰۃ

حی۔ علی الفلاح

حی۔ علی الفلاح

الصلوٰۃ خیرٌ من النوم

الصلوٰۃ خیرٌ من النوم اللہ اکبر اللہ اکبر۔

اذان ختم ہو گئی ہے۔

عبدالرحمٰن : (آواز میں ارتعاشِ مسرت) بدر! میں نے تسکین کا سامان ڈھونڈ لیا ہے۔

بدر : کیسا سامان؟

عبدالرحمٰن : آج اِس اذان نے مجھے یہ راز بتا دیا ہے بدر! یہ میرے اللہ

کی مزید رحمت ہے ۔ یہ میرے پروردگار کا مزید کرم ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر سفر کی تیاری کرو صبح ہی صبح تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو چلے جانا چاہیے ۔

بدر : بہتر یا امیر

(وقفہ موسیقی ۔ محل کا ایک حصہ امیر عبدالرحمٰن اور بدر مصروفِ گفتگو ہیں)

عبدالرحمٰن : تم لوگ واپس آ گئے ہو ۔ کہاں کہاں گئے تھے ؟

بدر : ہر اُس جگہ جہاں ہم نے سُنا کہ کوئی شاندار مسجد تعمیر ہوئی ہے ۔

عبدالرحمٰن : یہ نقشے ہیں ؟

بدر : اُن ساری مسجدوں کے نقشے جنہیں ہم نے دوسری مسجدوں سے بہت حد تک مختلف پایا ہے ۔

(ذرا سا وقفہ)

عبدالرحمٰن : بدر !

بدر : ارشاد یا امیر ۔

عبدالرحمٰن : کوئی اور نقشہ ؟

بدر : آپ کے اپنے وطن کی مسجد کا نقشہ بھی لے آیا ہوں ۔

عبدالرحمٰن : شام کی بات کرتے ہو ۔ میرا یہ وطن تو پورے کا پورا میرے سینے میں آباد ہے ۔ تم جس مسجد کا نقشہ لے کر آئے ہو اُسے دیکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ میں اُس کی ایک ایک دیوار ایک ایک گنبد ایک ایک دروازے سے واقف ہوں ۔

بدر : تو آپ کی نظرِ انتخاب اس نقشے پر پڑی ہے ؟

عبدالرحمٰن : نہیں بدر ! تنہائی کے لمحوں میں میں نے خود بھی ایک نقشہ تیار کیا ہے یہ دیکھو ۔

بدر : امیر ! آپ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ آپ کا پورا وطن آپ کے سینے میں آباد ہے ۔

عبدالرحمٰن: یہ شام کی جامع مسجد کا ہو بہو نقشہ تو نہیں ہے۔

بدر: یہ بے شمار ستون جیسے شام کے صحرا میں خرما کے درختوں کی قطاریں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی ہیں۔

عبدالرحمٰن: نقشہ بناتے وقت مجھے اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اب مسجد کی تعمیر شروع ہو جانی چاہیے۔

بدر: یا امیر! مجھے پہلے خیال نہیں رہا۔ ایک پادری حضور کی خدمت میں حاضری دینے کا آرزومند ہے۔

عبدالرحمٰن: اسی لمحے بلاؤ۔

(ذرا سا وقفہ)

خوش آمدید محترم بزرگ۔

پادری: میں اس خوش آمدید کے لیے اپنی طرف سے اور قرطبہ کے اُن تمام عیسائیوں کی طرف سے جن کی ترجمانی کا فرض میرے سپرد کیا گیا ہے۔ امیرِ اندلس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

عبدالرحمٰن: کیوں زحمت فرمائی آپ نے؟

پادری: ہم نے سُنا ہے کہ آپ ہمارے پرانے چرچ سے ملحقہ زمین پر مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

عبدالرحمٰن: آپ نے بالکل درست سُنا ہے۔

پادری: یہ زمین ہمارے چرچ سے الگ نہیں ہے۔ یہ چرچ ہی کی زمین ہے۔

عبدالرحمٰن: محترم بزرگ! آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ ہم یہ زمین آپ سے خریدیں گے نہیں اور جو قیمت آپ طلب کریں گے وہ ہم ادا نہیں کریں گے؟

پادری: امیرِ اندلس! آپ کو سب اختیارات حاصل ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

عبدالرحمٰن: اس میں اختیارات کی کیا بات ہے؟

پادری : آپ صرف اپنے اختیارات استعمال کر کے ہی یہ زمین حاصل کر سکتے ہیں۔

عبدالرحمٰن : ہم کسی صورت بھی اپنے اختیارات استعمال نہیں کریں گے۔

پادری : تو پھر میں عرض کروں گا کہ آپ یہاں مسجد تعمیر نہیں کر سکتے۔

عبدالرحمٰن : ہم نے کہا نہیں کہ آپ جو بھی قیمت طلب کریں گے ہم خوشی سے ادا کریں گے۔

پادری : ہمارا اصول یہ ہے کہ چرچ کی زمین فروخت نہیں کی جا سکتی۔

عبدالرحمٰن : یہ آپ کا فیصلہ بدل نہیں سکتا؟

پادری : آپ بدل سکتے ہیں۔

عبدالرحمٰن : میں نہیں بدلوں گا۔

پادری : پھر یہ فیصلہ اٹل ہے۔ یہ قرطبہ کے سارے عیسائیوں کا فیصلہ ہے اب مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔

(ذرا سا وقفہ)

عبدالرحمٰن : (پادری کے الفاظ دہراتے ہوئے) پھر یہ فیصلہ اٹل ہے۔ یہ قرطبہ کے سارے عیسائیوں کا فیصلہ ہے۔ (بلند آواز سے) ناصر!

(ناصر حاضر ہوتا ہے)

ناصر : حضور!

عبدالرحمٰن : شہزادوں کو بلاؤ۔

ناصر : جیسا ارشاد۔

(وقفہ۔ دونوں شہزادے سلیمان اور ہشام آتے ہیں)

عبدالرحمٰن : سلیمان!

سلیمان : جی ابی۔

عبدالرحمٰن : ہشام تم بھی آ گئے ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ پرانے گرجے کی زمین

پر ہم مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پادری نے آکر ابھی ابھی بتایا ہے کہ وہ اپنی رضامندی سے یہ زمین فروخت کرنے پر آمادہ نہیں ہے تمہارا کیا مشورہ ہے؟

سلیمان : ابی۔ اس میں مشورے کی کیا ضرورت ہے؟

عبدالرحمٰن : کیوں، مشورے کی ضرورت کیوں نہیں؟

سلیمان : آپ امیر اندلس ہیں۔ سب قسم کے اختیارات آپ کو حاصل ہیں تعمیر شروع کرا دیں کون روک سکتا ہے آپ کو؟

عبدالرحمٰن : زبردستی کریں؟

سلیمان : زبردستی نہیں یہ آپ کا حق ہے۔

عبدالرحمٰن : ہشام! کیا تم بھی اپنے بھائی کے بیان کی تائید کرتے ہو؟

ہشام : نہیں ابا جان۔

عبدالرحمٰن : ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم زبردستی اس زمین پر قبضہ کر کے تعمیری کام شروع کرا دیں؟

ہشام : یہ مسئلہ بہت نازک ہے۔ ابّی!

عبدالرحمٰن : تو کیا چاہتے ہو؟

ہشام : میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔

عبدالرحمٰن : کب کہو گے؟

ہشام : دو دن بعد۔

عبدالرحمٰن : ٹھیک ہے۔ ہم دو دن بعد تم سے تمہاری رائے دریافت کریں گے۔

(وقفہ۔ پس منظر میں موسیقی جاری رہتی ہے۔ ہشام امیر اندلس کے کمرے میں آ رہا ہے)

عبدالرحمٰن : کیوں ہشام!

ہشام : دو دن گزر گئے ہیں۔

عبدالرحمٰن : تو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

ہشام : میں پادری سے ملا تھا اس ملاقات کی روداد آپ کی خدمت

میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

(فلیش بیک۔ پادری کا کمرہ۔ پادری کمرے میں کھڑا ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے، پادری دروازہ کھولتا ہے۔ ہشام آتا ہے)

پادری : آپ شہزادہ صاحب۔

ہشام : آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

پادری : خود زحمت فرماکر آپ نے مجھے بہت شرمندہ کیا ہے۔ حکم کرتے میں فوراً حاضر ہوجاتا۔

ہشام : غرض مجھے پیش کرنی تھی آپ کی خدمت میں۔ نہ کہ آپ کوئی درخواست لے کر آنا چاہتے تھے۔

پادری : آپ گرجے کی زمین کے سلسلے میں تشریف لاتے ہیں؟

ہشام : جی ہاں۔

پادری : میں نے اپنی قوم کا فیصلہ امیر اندلس کی خدمت میں پیش کردیا تھا لیکن آپ کو تردّد کس بات کا ہے؟ میں نے سُنا ہے کہ سوائے آپ کے تمام شہزادے اور سلطنت کے مشیر طاقت استعمال کرکے زمین پر قبضہ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

ہشام : اگر امیر اندلس اس مطالبے کو جائز سمجھتے تو مجھے یہاں آنے اور مسجد کی تعمیر میں تاخیر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

پادری : آپ بھی اس مطالبے کو جائز نہیں سمجھتے؟

ہشام : میں امیر اندلس کی رائے سے متفق ہوں مگر مسجد کی تعمیر بھی بہت ضروری ہے۔

پادری : اور اسی جگہ؟

ہشام : جی ہاں۔ کیا کوئی ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ آپ اپنی رضامندی کے ساتھ یہ زمین فروخت کردیں؟

پادری : ایک صورت ہے۔

ہشام : بتائیے وہ صورت کیا ہے؟

پادری : ہمارے بہت سے گرجے ویران پڑے ہیں۔ بعض تو کھنڈر بھی بن چکے ہیں۔ میری قوم کے لوگ یہاں نہیں جاتے۔ اگر آپ ہماری یہ شرط مان لیں کہ اُن تمام گرجوں کی خود مرمت کروا کر اُن کا پورا نظم و نسق ہمارے حوالے کردیں گے تو میری قوم کو اس زمین کی ملکیت سے دستبردار ہونے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

ہشام : یہ ہے آپ کی شرط؟

پادری : صرف میری نہیں، میری قوم کی ہے۔

ہشام : اِس شرط کو ماننا یا رد کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے، میں امیر اُندلس سے گفتگو کروں گا۔

پادری : میں ایک بار پھر واضح کردوں کہ زمین پر قبضہ کرنے کی صرف دو صورتیں ہیں۔ زبردستی تعمیر شروع کرادیں یا ہماری یہ شرط تسلیم کریں۔

(منظر بدلتا ہے۔ ہشام امیر عبدالرحمٰن کے سامنے کھڑا ہے)

عبدالرحمٰن : ہشام! تمہاری کیا رائے ہے! یعنی میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

ہشام : میں پادری کا مطالبہ تسلیم کرلیتا۔ اس ملک میں رہنے والی ہر قوم کے مذہبی جذبات کا احترام کرنا ہماری حکومت کا فرض ہے۔

عبدالرحمٰن : مرحبا بیٹے! تجھ سے یہی اُمید تھی۔ ہم عیسائیوں کے تمام پرانے گرجوں کی مرمت کروادیں گے بلکہ یہ زمین مُفت حاصل نہیں کریں گے اس کی پوری پوری قیمت ادا کریں گے، پادری کو اطلاع کردو کہ آج ہی آکر قیمت وصول کرے۔ کل صبح میں مسجد کی پہلی اینٹ رکھوں گا۔

ہشام : انشاء اللہ تعالیٰ۔

(بہت ہلکی موسیقی۔ عبدالرحمٰن کی آواز دُعائیہ انداز میں اُبھرتی ہے)

عبدالرحمٰن: اے ربِ جلیل! مَیں تیری رحمت کے سائے میں آج اِس مسجد کی پہلی اینٹ رکھ رہا ہوں۔

اے اللہ میں زندگی کے باقی ایام اِس کی تعمیر پر صرف کردوں گا۔ مجھے توفیق دے کہ اسے ہر لحاظ سے ایک بے مثال اور عظیم الشان مسجد بنا دوں۔

اے خدا۔ اِس کے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور برسے اور اس کا بلند مینار جبریل کی جلوہ گاہ بنے۔

(عبدالرحمٰن خود اذان دیتا ہے)

اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

(اذان کی آواز بھاری پتھروں کے گرنے، پتھروں کو کوٹنے اور اس قسم کے باقی شور میں ڈوب جاتی ہے۔ یہ شور مسلسل کئی لمحے جاری رہتا ہے۔ شور پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ موسیقی ابھرتی ہے اور پھر وہی شور)

بدر: امیرالمومنین آپ؟

عبدالرحمٰن: بدر! آج تم نے مجھے کس نام سے پکارا ہے؟

بدر: معافی کا خواستگار ہوں حضور!

عبدالرحمٰن: مَیں نے منع کر دیا ہے کہ مجھے کوئی شخص بھی امیرالمومنین کہہ کر مخاطب نہ کرے۔

بدر: مَیں جانتا ہوں امیر!

عبدالرحمٰن: پھر آج تم نے یہ غلطی کیوں کی ہے؟

بدر: امیر! مَیں سالہا سال سے آپ کے ساتھ ہوں۔ مَیں نے آپ کو ہر حالت میں دیکھا ہے۔ موت کے سائے میں بھی دیکھا ہے۔ اور عظمت کی بلندیوں پر

بھی دیکھا ہے، مگر آج آپ کو جس حال میں دیکھ رہا ہوں ۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا اور جب اعتبار آیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ آپ ہی ایک مزدور کی طرح پتھر ڈھو رہے ہیں تو خدا کی قسم میرے ہونٹوں سے امیر المومنین کے الفاظ نکل گئے ۔

عبدالرحمٰن : کیوں کیا امیر اندلس اتنا ناکارہ انسان ہے کہ مسجد کے لیے پتھر نہیں ڈھو سکتا ؟

بدر : حضور، یہ تو ایسا کام ہے جو خلفائے راشدین بھی کرتے رہے ہیں ۔

عبدالرحمٰن : پھر تو یہ میرے لیے خصوصی سعادت کا ذریعہ ہے۔ خلفائے راشدین، اللہ کی لاکھ لاکھ رحمتیں ہوں اُن پر۔ میں نے اُن کی پیروی کی ہے ۔

بدر : اِس میں کیا شک ہے یا امیر!

عبدالرحمٰن : بدر، مجھے ایک فکر ستانے لگی ہے ۔

بدر : کونسی فکر جناب ؟

عبدالرحمٰن : پتھر اُٹھاتے ہوئے میں نے محسوس کیا ہے کہ میری توانائی پہلی جیسی نہیں رہی ۔

بدر : یہ عُمر کا تقاضا ہے ۔

عبدالرحمٰن : عُمر کا تقاضا ہے ۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں ۔ بڑھاپے میں انسان موت کو اپنے قریب دیکھنے لگتا ہے ۔ میں موت سے خوف زدہ نہیں ہوں ۔ ہر حال میں میں موت کا خیر مقدم کروں گا ، مگر مسجد کی تعمیر کا کام بہت وسیع ہے ۔ کیا میں اسے مکمل دیکھ سکوں گا ؟ میرے دل میں یہ حسرت تو نہیں رہے گی کہ میرا فریضہ ادھورا ہے ، میں اسے پایۂ تکمیل نہیں پہنچا سکا ؟

بدر : ایسا نہیں ہوگا امیر!

عبدالرحمٰن : کون جانے ایسا ہوگا یا نہیں ہوگا ، بہر حال میرے اللہ کو جو منظور ہوگا وہی ہوگا ۔ میں نشائے ایزدی کے آگے ہر صورت میں سرِ تسلیم خم کرتا ہوں ۔

(تعمیر کے سلسلے میں شور جو مسلسل جاری رہتا ہے عبدالرحمٰن کی آواز

اِس شور میں بار بار اُبھرتی ہے)

عبدالرحمٰن : مرحبا۔ میرے ساتھیو!

تیزی سے، اور تیزی سے۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہو۔

مرحبا۔ مرحبا۔ مرحبا۔ اوہ۔

ہشام : ابا جان۔

عبدالرحمٰن : کچھ نہیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا ــــــ

ہشام : ابا جان چلیئے۔ محل میں چلیئے۔

(شور ختم ہو جاتا ہے)

عبدالرحمٰن : کام کیوں بند ہو گیا ہے۔ کام نہیں رُکنا چاہیے۔

ہشام : کام ہو گا ابّا جان۔ ہوتا رہے گا۔

(گزرانِ وقت کے لیے موسیقی)

عبدالرحمٰن : کام تو نہیں رُکا؟

ہشام : نہیں ابّا جان۔ سلیمان نگرانی کر رہا ہے۔

عبدالرحمٰن : اس سے کہو سختی سے نگرانی کرے۔

(ناصر اندر آتا ہے)

ناصر : یا امیر! پادری آیا ہے۔

ہشام : مَیں گفتگو کر لیتا ہوں ابا جان۔

عبدالرحمٰن : نہیں مَیں خود کروں گا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا ہے؟

ناصر : جی حضور۔

عبدالرحمٰن : لے آؤ اُسے۔

(ذرا سا وقفہ)

خوش آمدید۔

پادری : شکریہ امیرِ اندلس! مَیں ایک خاص غرض سے حاضرِ خدمت ہونے

کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

عبدالرحمٰن: فرمائیے۔

پادری: آپ نے عیسائی قوم کے ساتھ جو نیک سلوک کیا ہے۔ میری قوم تہ دل سے اس کے لیے حضور کا شکریہ ادا کرتی ہے اور اپنے دلی جذبات کا اظہار سُرخ دیناروں کی اس تھیلی کی صورت میں کرتی ہے، ہماری التجا ہے اسے ہماری طرف سے مسجد کی تعمیر پہ صرف کیا جائے۔

عبدالرحمٰن: (لہجے میں مسرت) مرحبا! میں آپ کے اور آپ کی قوم کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔

ہشام!

ہشام: جی ابا جان۔

عبدالرحمٰن: اس تھیلی کے دیناروں کو چار گنا کر دیا جائے اور یہ سارے دینار عیسائی قوم کی طرف سے مسجد کی تعمیر پر صرف کیے جائیں۔ پادری صاحب!

پادری: جی حضور!

عبدالرحمٰن: ہماری صحت ٹھیک ہوتی تو آپ کے ساتھ چل کر آپ کی قوم کا شکریہ ادا کرتے اب یہ ہمارا شکریہ آپ اپنے لوگوں تک پہنچا دیں۔

پادری: بہتر یا امیر!

(عبدالرحمٰن محل میں اپنے پلنگ پر لیٹا ہے۔ اپنے خادم ناصر کو آواز دیتا ہے)

عبدالرحمٰن: ناصر!

ناصر: حضور!

عبدالرحمٰن: ہشام مریدہ سے نہیں آیا ابھی تک؟

ناصر: آدمی انھیں بلانے کیلئے چلا گیا تھا حضور، شہزادہ صاحب آ ہی رہے ہونگے۔

عبدالرحمٰن: جب وہ آجائے تو ہمیں فوراً بتا دیا جائے۔

ناصر: جیسا حکم۔

(وقفہ موسیقی، ہشام آتا ہے)

ہشام : ابا جان! میں حاضر ہو گیا ہوں۔

عبدالرحمٰن : میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں بیٹا! موت کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

ہشام : فرمایئے ابا جان۔

عبدالرحمٰن : ہمارے بعد اس ملک کی حکومت کا بوجھ تمہیں اپنے کندھوں پر اٹھانا ہے۔ میں بہت بڑی اور بہت نازک ذمہ داری تمہارے سپرد کرتا ہوں میرے بیٹے!

ہشام : میں اپنا فرض پوری دیانت داری سے ادا کروں گا۔

عبدالرحمٰن : اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اے سعد بیٹے! یہ اندلس ہمارا وطن ہے۔ اس کی سرزمین ہماری سرزمین ہے۔ ہماری ساری امیدوں اور آرزوؤں کا گہوارہ ہے تمہیں اور تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ یہیں جئیں گے۔ اور یہیں مریں گے۔ سنا بیٹا۔ ہشام!

ہشام : جی ابا جان!

عبدالرحمٰن : تمہیں یاد ہے اسلام کے عظیم فرزند طارق بن زیاد نے کنارِ اندلس پر کشتیاں جلا کر کیا کہا تھا؟

ہشام : مجھے معلوم ہے ابا جان!

عبدالرحمٰن : ایک بات اور غور سے سنو۔

ہشام : میں ہمہ تن گوش ہوں۔

عبدالرحمٰن : مسجد کی تعمیر جاری رہنی چاہیے۔

ہشام : جاری رہے گی۔

عبدالرحمٰن : بس بیٹا! مجھے یہی کچھ کہنا تھا۔ ہاں اپنے بھائیوں کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آنا۔ ان کی غلطیوں کو فراخدلی سے معاف کر دینا۔ جاؤ اب مریدہ لوٹ جاؤ اور اپنی ذمہ داری سنبھالو۔

(گزرانِ وقت کے لیے موسیقی۔ منظر بدلتا ہے)

عبدالرحمٰن: عبداللہ بیٹے۔

عبداللہ: جی ابی!

عبدالرحمٰن: وہ وقت آگیا ہے جو اللہ کے حکم پر ہر انسان کے لیے مقرر ہے۔

عبداللہ: میں کیا خدمت کر سکتا ہوں ابی!

عبدالرحمٰن: مجھے اٹھاؤ۔ اپنا ہاتھ دو میرے ہاتھ میں۔

عبداللہ: لیجیے ابی!

عبدالرحمٰن: (سختی سے) عبداللہ۔

عبداللہ: ابی!

عبدالرحمٰن: تمہاری نبض اتنی تیزی سے کیوں چل رہی ہے۔ کیا تمہارے دل میں کوئی فاسد خیال آ رہا ہے؟

عبداللہ: نہیں تو ابی۔ میں اسی طرح آپ کا بیٹا ہوں جس طرح ہشام۔

عبدالرحمٰن: ہشام میں اور تم میں بڑا فرق ہے۔ یاد رکھو زمین پر فساد پیدا کرنے والے کو خالقِ کائنات ہرگز پسند نہیں کرتا اور اس کی گرفت بڑی شدید ہوتی ہے۔

عبداللہ: ابی میں۔

عبدالرحمٰن: خیر اب میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا بہتری کرے گا۔ مجھے وہاں لے چلو۔ مسجد میں۔

عبداللہ: اس حالت میں؟

عبدالرحمٰن: اس حالت میں۔ میری نگاہیں آخری بار اس کے۔ در و دیوار کو۔ اس کے گنبدوں کو۔ اس کے ستونوں کو چومنے کے لیے بےتاب ہیں۔

عبداللہ: آپ پلنگ پر بیٹھے رہیں۔

عبدالرحمٰن: نہیں۔ مَیں اپنے پاؤں پر چل کر جاؤں گا۔ مجھے صرف سہارا دو۔ بس ۔ اور کچھ نہیں۔

(پس منظر کی موسیقی پیش منظر میں آ جاتی ہے اور یہ موسیقی آہستہ آہستہ مزدوروں کے شور میں دب جاتی ہے)

عبدالرحمٰن: سبحان اللہ ۔۔ یہ ہے میرا حریم قلب ۔۔ یہ ہے میرے خوابوں کی کہکشاں ۔۔ یہ ہے میری اُمیدوں کا چاند۔ یہ ہے میری روح کا سرمایہ۔

عبداللہ: آہستہ چلئے ابی!

عبدالرحمٰن: لگتا ہے یہ دیواریں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ ان کے سائے کائنات میں اُفق تا اُفق پھیل گئے ہیں۔

(مزدوروں کا شور مدھم پڑ جاتا ہے)

عبدالرحمٰن: عبداللہ!

عبداللہ: ابی!

عبدالرحمٰن: کام کیوں بند ہو گیا ہے۔ مزدوروں نے کیوں کام بند کر دیا ہے؟

عبداللہ: آپ کو دیکھنے لگے ہیں ابی!

عبدالرحمٰن: ان سے کہو کام کریں۔ کام کریں۔ کام کریں۔ اپنے ہاتھ مت روکیں۔ مت روکیں۔ (بلند آواز سے) کام کرو۔ کام کرو۔

(شور پھر برپا ہو جاتا ہے)

عبداللہ: ابی! آپ تنہا اندر جانا چاہتے ہیں؟

عبدالرحمٰن: ہاں مَیں تنہا جاؤں گا۔ اللہ کے گھر جانے کے لیے بندے کا سہارا ڈھونڈوں؟ نہیں۔ (تیز عربی موسیقی) اور یہ ستون۔ ہر ایک کی پیشانی جبینِ جبریل کی طرح چمک رہی ہے۔ (دعائیہ انداز میں) اے اللہ ان دیواروں کو ہمیشہ سلامت رکھنا۔ یہ ستون چھت کا بوجھ اُٹھائے ہمیشہ مضبوطی سے کھڑے رہیں اور ان کے اُوپر بلندیوں پر اسلام کی عظمت کا پرچم ہمیشہ لہراتا رہے۔

زور سے اذان کی آواز آتی ہے۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

عبدالرحمٰن : (اندرونی جوش سے) اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ۔ اکبر۔

دبیز موسیقی کی ایک لہر۔ جو میدانِ جنگ کے ہنگامے میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں۔ تلواروں کی جھنکار۔ گیرودار کا شور۔ یہ شور بتدریج کم ہونے لگتا ہے۔ ہشام کی گرجتی ہوئی اور غضب ناک آواز بلند ہوتی ہے)

ہشام : عبداللہ!

عبداللہ : (آواز میں عاجزی) جی۔

ہشام : میں پوچھتا ہوں تمہیں میرے خلاف بغاوت کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟ تم کیسے بھول گئے کہ اباجان نے اپنی زندگی ہی میں حکومت کی ذمے داری میرے سپرد کر دی تھی۔ تم نے کس طرح شاہی محل پر قبضہ کر لیا۔ کس طرح قرطبہ میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ تم نے خدا کی زمین پر فساد پیدا کیا۔ مسلمان سپاہیوں کے قیمتی خون کو خاک میں ملا دیا۔ جواب دو۔ یہ سب کچھ تم نے کیوں کیا؟ بولو۔ بولو۔ جواب دو۔

عبداللہ : یہ میری غلطی تھی۔

ہشام : اقتدار کی ہوس نے تمہاری آنکھوں پر بھاری پٹی باندھ دی تھی تم روشنی اور تاریکی میں تمیز نہ کر سکے۔

عبداللہ : میں نادم ہوں۔

ہشام : نادم ہو۔ سچے دل سے!

عبداللہ : بربِ کعبہ۔

ہشام : تمہیں اللہ معاف کرے۔ مگر تمہیں ایک آزمائش سے گزرنا پڑیگا۔ سات روز تک مسجد کی تعمیر کے لیے مزدوروں کے ساتھ مزدور بن کر کام کرنا پڑے گا۔

(منظر بدلتا ہے۔ موسیقی جو دریائے وادی الکبیر کی لہروں کے شور میں

مدغم ہو جاتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد یہ شور ختم ہو جاتا ہے)

ہشام: خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج وادی الکبیر کا پُل مکمل ہو گیا۔

یوسف: تاریخ آپ کے اس کارنامے کو کبھی نہیں بھولے گی۔

ہشام: مَیں نے یہ پُل اس وجہ سے تعمیر نہیں کرایا کہ تاریخ مجھے یاد رکھے۔ مَیں نے سوچا تھا کہ یہ پُل جس قدر شاندار ہو گا مسجد کی شان میں اسی قدر اضافہ ہو گا۔ وہ مسجد کی بلندو پُر عظمت دیواریں۔ وہ اس کے خوبصورت اور باوقار گنبد اور ادھر یہ وسیع اور دلآویز پُل۔ کیا ان دونوں کا جلال و جمال دیکھنے والے کے دل میں ایک پُراسرار اور مسرت انگیز تصور پیدا نہیں ہوتا؟

یوسف: یقیناً ہوتا ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ مسجد تک آنے اور یہاں سے جانے کے لیے لوگوں کے لیے سہولت میسر ہو گئی ہے۔ آپ کے لیے بھی یہ سہولت ہے کہ شکار —

ہشام: اس پُل کا میرے شکار سے کیا تعلق ہے؟

یوسف: جناب! میرا مطلب ہے آپ کو شکار کا بہت شوق ہے۔

ہشام: مَیں نے پوچھا ہے کہ پُل اور میرے اس شوق کے درمیان کیا رابطہ ہے؟

یوسف: آپ ہی اس سہولت سے فائدہ اٹھائیں گے۔ شکار گاہ کو جانے اور وہاں سے آنے کے لیے۔

ہشام: گویا تمہارا مطلب ہے مَیں نے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے ہی یہ پُل بنایا ہے؟

یوسف: حضور! آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟

ہشام: تم نے اس طرح سوچا ہے؟

یوسف: مَیں نے نہیں۔

ہشام: تو پھر یہ خیال کس کا ہے؟

یوسف: کسی کا بھی نہیں۔

ہشام : یوسف! تم میرے بڑے بہادر سپاہی ہو۔ مجھے تمہاری ذات پر پورا پورا اعتماد ہے مگر میں یہ بات ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ تم کوئی چیز مجھ سے چھپاؤ۔ حقیقت کیا ہے مجھے صاف صاف بتاؤ۔

یوسف : حضور! کل میں بازار سے گزر رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز آئی۔ کوئی شخص کسی سے مخاطب ہو کر یہی بات کہہ رہا تھا۔

ہشام : کہ یہ پُل میں نے اپنا شوق پورا کرنے کے لیے بنوایا ہے۔

یوسف : ذرا سہولت پیدا کرنے کے لیے۔

ہشام : خدائے علیم و بصیر کو علم ہے کہ میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔

یوسف : مجھے آپ کی ذات پر مکمل اعتماد ہے۔

ہشام : تمہیں یقین آگیا ہے لیکن اس شخص کو کیسے یقین آئے گا جس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ یہ الفاظ کہنے والے اور انہیں صحیح سمجھنے والے نہ جانے اور کتنے لوگ ہوں گے۔ یوسف! میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ آخری سانس تک اس پُل پر قدم نہیں رکھوں گا۔

یوسف : ایسا نہ کہیے حضور!

ہشام : اللہ مجھے اس ارادے میں استقامت دے۔ چلو اب مسجد کی طرف۔

یوسف : یا امیر آپ ایک مرتبہ تو۔

ہشام : چلو یوسف!

(وقفہ موسیقی۔ یہ موسیقی پتھروں کو کوٹنے، اٹھانے، گرنے کے شور میں جذب ہو جاتی ہے)

ہشام : عبداللہ کہاں ہے؟

یوسف : مجھے پہلے ہی اس کی توقع تھی یا امیر!

ہشام : تم سمجھتے تھے کہ عبداللہ مزدوروں کے ساتھ مل کر کام نہیں کرے گا۔

یوسف : جی ہاں۔ نازو نعم میں پلا ہوا شہزادہ اس قسم کی سختیاں نہیں سہہ سکتا۔

ہشام : لیکن ابا جان نے بڑھاپے میں بھی پتھر ڈھوئے تھے۔

یوسف : مرحوم و مغفور امیر اندلس کا معاملہ دوسرا ہے۔ انہوں نے ساری زندگی بے حد سختیاں سہی تھیں۔

ہشام : اس طرف پتھر کیوں بے بیکار پڑے ہیں مزدور کہاں گئے؟

یوسف : وجہ معلوم کرتا ہوں (ذرا سا وقفہ) ایک مزدور پتھر اٹھاتے ہوئے زخمی ہوگیا تھا۔ مزدور اسے اس کے گھر پہنچانے گئے ہیں۔

ہشام : کون ہے وہ مزدور جو زخمی ہوگیا تھا؟ تفصیل پوچھ کر بتاؤ۔

یوسف : بہتر یا امیر۔

(موسیقی آہستہ آہستہ تھم جاتی ہے۔ رات کا وقت۔ ہشام معمولی لباس پہنے محل کے دروازے کی طرف جا رہا ہے۔ والدہ ہشام اس کی طرف آتی ہے)

والدہ : ہشام بیٹے!

ہشام : جی امی!

والدہ : کدھر جا رہے ہو رات کے وقت!

ہشام : آپ جانتی ہیں امی۔ کبھی کبھی رات کو گشت لگایا کرتا ہوں۔

والدہ : میں نے سنا ہے تم نے تین چار دن پہلے اپنے بھائی عبداللہ کو مسجد کے مزدوروں کے ساتھ کام کرنے کا حکم دیا تھا؟

ہشام : آپ کو معلوم ہے باغی کی کیا سزا ہونی چاہیے؟

والدہ : تم اسے زنجیروں میں جکڑ کر قید خانے میں ڈال دیتے تو بہتر تھا۔

ہشام : میں نے اسے معاف کر دیا تھا۔

والدہ : معاف کر کے مزدور بنا دیا؟

ہشام : یہ اس لیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ایک ایسے کام پر صرف کرے جو امیر عبدالرحمن کے بیٹے کے لیے ہر طرح مناسب ہے۔ مجھے یقین تھا یہ کام

اس کے گندے ارادے کو بدل سکتا ہے!

والدہ : اس کے ارادے بدل گئے ہیں (طنزاً) اس لیے بھاگ گیا ہے۔

ہشام : مجھے اس کا علم ہو گیا ہے۔ وہ آج مزدوروں میں موجود نہیں تھا۔

والدہ : ہو سکتا ہے وہ یہیں کہیں ہو اور اس کے سینے میں خوفناک ارادے پرورش پا رہے ہوں یا پا چکے ہوں۔ ہشام! تمہیں خطرے میں نہیں کودنا چاہیے۔ میں تمہاری ماں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔

ہشام : امی! مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

والدہ : یہ تم کہہ سکتے ہو، میں نہیں کہہ سکتی۔ میں جو تمہاری ماں ہوں جسے تم بے حد عزیز ہو۔ جس کی تم زندگی ہو!

ہشام : کیا آپ نے مجھے اللہ کی حفاظت میں نہیں دے رکھا؟

والدہ : کیا اللہ کا یہ حکم نہیں ہے کہ انسان کو اپنی حفاظت آپ بھی کرنی چاہیے؟

ہشام : امی میں اپنی حفاظت کرنی جانتا ہوں۔

والدہ : تنہا کس طرح حفاظت کرو گے؟

ہشام : میں تنہا نہیں رہوں گا امی! اور آپ خوب جانتی ہیں کہ جو ہستی میرا ساتھ دے گی وہ خدائے بزرگ و برتر کے سوا اور کون ہے؟ اس لیے اب مجھے روکیے نہیں امی!

والدہ : ضرور جاؤ گے؟

ہشام : آپ کی اجازت کے بغیر نہیں ــــ میری گزارش ہے آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔

والدہ : اچھا خدا حافظ! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے!

ہشام : خدا حافظ۔

(وقفہ - ہلکی موسیقی)

ہشام : کون ہو تم ؟

یوسف : مَیں۔

ہشام : کون ! یوسف تم ؟

یوسف : جی۔

ہشام : تم میرے پیچھے پیچھے کیوں آ رہے ہو ؟

یوسف : ام عالیہ کا حکم کیسے ٹالا جا سکتا ہے ! انہوں نے کہا تھا تم میرے بیٹے کے پیچھے جاؤ۔ خدانخواستہ۔ امیر المومنین ! ہر ماں کا دل اپنے بیٹے کیلئے اس طرح مضطرب رہتا ہے۔

ہشام : تو اب واپس چلے جاؤ۔

یوسف : آپ کے ساتھ رہوں تو کیا حرج ہے ؟

ہشام : کوئی ہرج نہیں۔

(وقفہ موسیقی - دروازے پر دستک)

عبداللہ : کون ہے ؟

ہشام : یوسف ! یہ آواز تو عبداللہ کی معلوم ہوتی ہے۔ تم نے زخمی مزدور کے گھر کا پتہ پوچھا نہیں تھا۔

یوسف : یہ وہی گھر ہے حضور !

(دروازہ کھلتا ہے)

عبداللہ : امیر المومنین !

ہشام : عبداللہ ! یہ کس کا گھر ہے ! تم یہاں کیا کر رہے ہو ؟

عبداللہ : یا اخی ! یہ اس مزدور کا گھر ہے جو آج دوپہر کے وقت پتھر اُٹھاتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا۔ مَیں اس کے ساتھ کام کر رہا تھا اس لیے مَیں نے اپنا فرض جانا کہ اپنے ساتھی کی عیادت کر دں۔ اس کے ساتھ ہی یہاں آ گیا۔

ہشام : مرحبا میرے عزیز بھائی ! مَیں نے بالکل ٹھیک سوچا تھا کہ جو شخص

مسجد کے سائے میں رہ کر مسجد کے لیے مشقت اُٹھاتے اس کے خیالات بدل جاتے ہیں۔ آؤ میرے گلے لگو! ۔ (وقفہ) اب کیا حال ہے اس کا؟

عبداللہ : بہتر ہے۔

ہشام : مجھے لے چلو اس کے پاس۔

عبداللہ : چلئے! (وقفہ)

ہشام : سو رہا ہے تو جگاؤ نہیں۔ آرام کرنے دو۔ زخم کی حالت کیسی ہے؟

عبداللہ : حکیم نے کہا ہے چند دن تک مندمل ہونے میں لگیں گے۔

ہشام : عبداللہ یہ لو۔ یہ تھیلی اسے دے دینا اور تم مزدوروں کے ساتھ کام نہیں کرو گے۔

عبداللہ : شکریہ امیرالمومنین!

(گزرانِ وقت کے لیے موسیقی۔ شاہی محل کے اندر ہشام کے خاص کمرے میں ماں داخل ہوتی ہے۔ ہشام کا پلنگ خالی پڑا ہے اور ناصر ایک طرف کھڑا ہے)

ماں : ناصر! ہشام کہاں ہے!

ناصر : مجھے معلوم نہیں امیرالمومنین کہاں تشریف لے گئے ہیں۔

ماں : تجھے معلوم نہیں۔ کیا کر رہا ہے تو؟

ناصر : ہم سب یہاں تھے۔ امیرالمومنین پلنگ سے اُٹھے اور باہر چلے گئے۔

ماں : کیوں باہر چلے گئے؟

ناصر : ہم ان سے کیسے پوچھ سکتے تھے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟

ماں : تم لوگ ان کے پاس تھے اور تمہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ علیل ہیں؟

ناصر : ہم سب کو اس بات کا علم ہے۔

ماں : تم ان کی عیادت کر رہے تھے اور وہ جانے لگے تو انہیں روکا نہیں کم از کم مجھے آ کر خبر کر دیتے۔

ناصر : ہم ان کی حکم عدولی نہیں کر سکتے تھے۔
ماں : کیسی حکم عدولی؛
ناصر : انہوں نے منع کر دیا تھا کہ میرے جانے کی کسی کو اطلاع نہ دی جائے۔
ہم مجبور تھے۔
ماں : جاؤ، سب جاؤ اور دیکھو وہ کہاں ہیں۔
ناصر : میرا خیال ہے وہ مسجد کی طرف گئے ہیں۔
ماں : اِدھر جاؤ۔ ٹھہرو میں خود جاتی ہوں۔
(ہشام آتا ہے۔ سادہ کپڑوں پر جا بجا داغ اور دھبے، ٹانگیں لڑکھڑا رہی ہیں)
ماں : ہشام! میرے بیٹے تو کہاں چلا گیا تھا اس بیماری میں۔ اور یہ۔ ہشام! کیا کرتے رہے ہو میرے بیٹے! یہ سب کچھ کیا ہے؟
ہشام : کچھ نہیں امی! پریشان کیوں ہو گئی ہیں آپ؟
ماں : تیری یہ حالت کیوں ہے ہشام! لگتا ہے تو مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا ہے۔
ہشام : امی! آج یہ شرف مجھے حاصل ہو گیا ہے۔
ماں : تو ٹھیک طور پر تو کھڑا ہو سکتا اس حال میں۔ خدا کی پناہ!
ہشام : امی! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں جانبر نہیں ہو سکوں گا۔
ماں : نہیں بیٹے! یہ نہ کہو۔ یہ نہ کہو میرے جگر پارے!
ہشام : (ماں کے الفاظ سُنے ان سُنے کرکے) امی میری آرزو ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں مسجد کا ایک مزدور بن کر جاؤں۔
ماں : ہشام!
ہشام : اس لیے یہ دن میں نے مسجد کے زیرِ سایہ گزارا ہے۔ مزدوروں

کے ساتھ کام کرے۔

ماں : (بمشکل آنسو ضبط کرتے ہوئے) بیٹا!

ہشام : میری یہ خواہش ہے کہ میرا یہی لباس میرا کفن بنا دیا جائے۔

ماں : (روتے ہوئے) یہ لباس جس پر بے شمار دھبّے پڑے ہیں۔

ہشام : مجھے یہ دھبّے بہت عزیز ہیں۔ میں یہی دھبّے لے کر اپنے رحیم و کریم پروردگار کے پاس جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے انہی دھبوں کی وجہ سے میری مغفرت ہو جائے۔ وہ ذات پاک بڑی رحمتوں والی ہے! امّی! جب میں ابّا جان کو بتاؤں گا کہ جس مسجد کا کام وہ ادھورا چھوڑ آئے تھے وہ آج کتنی شاندار، وسیع اور جمیل و جلیل ہو چکی ہے تو انہیں کتنی خوشی ہوگی۔ کس قدر مسرور ہوں گے وہ۔

(ماں کی سسکیاں پس منظر میں جاری ہیں۔ موسیقی پیش منظر میں۔ شاہی محل۔ اُندلس کا فرماں روا "حکم" اپنے کمرے میں سر جھکائے کھڑا ہے۔ سامنے ماں یعنی اس کی دادی کھڑی اسے غور سے دیکھ رہی ہے)

ماں : حکم!

حکم : جی دادی اماں!

ماں : معلوم ہوتا ہے ملک کے قحط نے تجھے بہت پریشان کر دیا ہے۔

حکم : مجھے بتایا گیا ہے کہ اس ملک میں کبھی اتنا بڑا قحط نہیں پڑا تھا۔ لوگ بھوک کے ہاتھوں سسک رہے ہیں۔ میں سارا دن بازاروں میں گھومتا رہا ہوں۔ کہیں بھی مجھے وہ رونق دکھائی نہیں دی جو قرطبہ کے گلی کوچوں میں صبح و شام رہتی تھی۔ قحط اور خشک سالی نے ساری رونق ختم کر دی ہے۔

ماں : حکم! میں نے یہ بھی سنا ہے کہ مسجد کی تعمیر رُک گئی ہے۔

حکم : ایسا ہو گیا ہے دادی اماں!

ماں : ایسا کیوں ہوا ہے؟

حکم : مزدور کام چھوڑ کر گھروں میں جا بیٹھے ہیں۔

ماں: تو نے ان کے لیے کچھ انتظام نہیں کرایا؟

حکم: مجھ پر سب لوگوں کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا کر رہا ہوں۔

ماں: اِدھر آ۔ چل میرے ساتھ۔

حکم: کہاں دادی اماں!

ماں: میرے کمرے میں۔ (وقفہ)

یہ کاغذ تیرے باپ ہشام نے موت سے چند روز پیشتر میرے حوالے کیا تھا اور کہا تھا کہ اگر آپ کی زندگی میں مسجد کا کام رُک جائے تو یہ کاغذ اس شخص کے سپرد کر دیں جو اندلس کا حکمران ہو اور آپ کی زندگی میں کام جاری رہے تو یہ رقعہ میرے انہی الفاظ کے ساتھ اپنے کسی معتمد کے سپرد کر دیں۔ میں آج اپنا فرض ادا کرتی ہوں۔ لو۔ اسے پڑھو۔ اور (وقفہ) مجھے بھی بتاؤ اس میں ہشام نے لکھا کیا ہے۔

حکم: ابا جان نے لکھا ہے (پڑھتے ہوئے) "مسجد کے مکمل ہونے تک تعمیر کا کام جاری رہنا چاہیے۔ کبھی رُک گیا تو میری روح کو سخت دُکھ ہو گا۔"

ماں: میری روح کو سخت دکھ ہو گا۔ تو اس کی روح کو سخت دُکھ ہو رہا ہے۔ (حکم ماں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا) حکم! تُو نے مسجد کے متعلق جو اپنا منصوبہ بنایا تھا وہ پورا ہو گیا ہے؟

حکم: نہیں دادی اماں! (عبداللہ اندر آتا ہے) آئیے چچا جان! آپ کچھ کہنے کے لیے آئے ہیں۔

عبداللہ: ہاں میں ایک ایسی خبر لے کر آیا ہوں جس سے آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی۔

حکم: کیا خبر ہے؟

عبداللہ: اندلس کے پادریوں کے نمائندے نے کہا ہے کہ اگر آپ ہمارے گرجوں کو محفوظ رہنے دیں تو امیرِ اندلس جتنی رقم چاہیں ہم سے وصول کر سکتے ہیں

ہم خوشی سے یہ رقم ادا کر دیں گے۔

حکم : آپ یہ خبر لے کر آئے ہیں؟

عبداللہ : صرف خبر نہیں خوش خبری!

حکم : چچا جان! آپ کو معلوم نہیں کہ دادا جان نے پرانے اور شکستہ گرجوں کی خود مرمت کرائی تھی اور اس کے عوض مسجد کے لیے زمین حاصل کی تھی۔ اس معاہدے کا احترام ہم پر فرض ہے۔ آج کون ان گرجوں کو گرا سکتا ہے، کون ہے جو ان گرجوں کے گرانے کی تجویز پیش کر رہا ہے؟

عبداللہ : وہ خود خوف زدہ ہو کر انہیں گرانا چاہتے ہیں۔

حکم : چچا جان! یہ گرجے نہیں گرائے جائیں گے۔ یہ گرجے نہیں گرائے جا سکتے۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔

عبداللہ : تو وہ رقم لے لینی چاہیے جو وہ دینا چاہتے ہیں۔

حکم : ہمیں سرمائے کی اشد ضرورت ہے۔

عبداللہ : سرمایہ تو مل رہا ہے۔

حکم : ہمیں اس سرمائے کی بالکل ضرورت نہیں۔ ہمارا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ محل میں سونے چاندی کے جتنے برتن موجود ہیں۔ جتنا بھی قیمتی سامان موجود ہے وہ دولت مندوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا جائے۔ ہمارے اس حکم پر فوراً عمل ہونا چاہیے۔

(تیز موسیقی جو مزدوروں کے شور میں ڈوب جاتی ہے۔ یہ شور کئی لمحے جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد جشن کی موسیقی میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

شاہی محل میں کھڑکی کے پاس اندلس کا حکمران محمد بن عامر منصور کھڑا ہے۔ منذر آتا ہے)

محمد بن عامر : آؤ عامر! میرا جی چاہتا تھا کہ اس وقت تم آ جاؤ۔ یہ شور سن رہے ہو؟

منذر: یہ شور نہیں جناب! جشنِ عام کی موسیقی ہے۔ جامع مسجد مکمل ہو گئی ہے میں آپ کو مبارک باد دینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

محمد بن عامر: سب تعریفیں تو اس ذاتِ بے ہمتا کے لیے ہیں جو اپنے عاجز بندے کو بڑے بڑے کام کرنے کی توفیق دیتی ہے۔ میں اپنے پروردگار کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں جس نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ میں مسجد کو مکمل کر دوں۔ میرا رواں رواں اس کا شکر گزار ہے۔

منذر: یہ آپ کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔

محمد بن عامر: سب سے بڑا فخر تو اس شخص کے لیے ہے جس نے اس کی ابتدا کی تھی۔ امیر عبدالرحمٰن الداخل کے بعد جس نے بھی اندلس کی حکومت سنبھالی اس نے مسجد کی توسیع میں اپنی استعداد کے مطابق حصہ لیا۔

منذر: سب سے زیادہ توسیع آپ نے کی ہے۔

محمد بن عامر: اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے اس عاجز بندے کو یہ توفیق دی۔

(ذرا سا وقفہ)

منذر: حضور! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟

محمد بن عامر: میں نے جو کچھ کیا ہے۔ تاریخ کے اوراق اسے فراموش نہیں کریں گے۔ آنے والی نسلیں انہیں میری نیک نیتی پہ بھی محمول کریں گی اور بدنیتی اور خود غرضی پر بھی۔ مگر مسجد کی یہ دیواریں اور مینار جب تک سلامت ہیں۔ میرا نام نیک بھی زندہ رہے گا۔ ان کے سائے میں دعا کے لیے جو ہاتھ اٹھیں گے وہ خدا سے میری مغفرت بھی چاہیں گے۔ یہ میری محنت اور جدوجہد کا بہت بڑا انعام ہے۔

(ذرا سا وقفہ)

منذر: آپ کی آنکھوں میں آنسو۔

محمد بن عامر: یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ اللہ کی بارگاہ میں شکریہ کے آنسو ہیں۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ میری حیثیت ہی کیا تھی۔ میرا مورثِ اعلیٰ ایک سپاہی تھا۔ میں نے جب اس دنیا میں پہلی بار آنکھ کھولی تو اپنے خاندان کو غربت کے شکنجے میں جکڑا ہوا پایا۔ اللہ نے مجھے محل میں پہنچنے کی توفیق دی۔ ملکہ عالیہ صبح نے میری چھپی ہوئی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا اور اپنے بیٹے کے مقابلے میں مجھے نوازا۔ اور میں حاجب بن گیا۔

منذر: آپ اندلس کے مختارِ کُل محمد بن عامر المنصور۔

محمد بن عامر: میں حاجب ہی کہلوانا پسند کرتا ہوں۔ چلو منذر۔

منذر: کہاں حضور!

محمد بن عامر: مسجد کی طرف۔

(وقفہ۔ جشن کی موسیقی تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔)

منذر: دیکھئے لوگ کس قدر خوش ہیں۔

محمد بن عامر: دیکھ رہا ہوں۔

(یکایک اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ موسیقی بالکل بند ہو جاتی ہے)

منذر: چلئے حضور! اذان ختم ہو گئی۔ آپ سوچنے کیا لگے ہیں۔

محمد بن عامر: یونہی ایک خیال ذہن میں آ گیا تھا۔

منذر: کون سا خیال حضور؟

محمد بن عامر: کیا کوئی ایسا دن تو نہیں آئے گا جب قرطبہ کی اس عظیم الشان جامع مسجد کے مینار مؤذن سے محروم ہو جائیں گے۔ جب مسجد کے یہ دروازے بند کر دیئے جائیں گے

(غمناک موسیقی جو کچھ لمحے جاری رہتی ہے)

(منظر بدلتا ہے۔ غرناطہ کے آخری حکمران ابو عبداللہ کے سامنے لاٹ پادری کھڑا ہے)

لاٹ پادری: میں نے بتا دیا ہے کہ اس ملک کے نئے حکمران کی طرف سے یہاں آیا ہوں۔

ابوعبداللہ: کس غرض سے؟

لاٹ پادری: کیا آپ نہیں جانتے کہ ایک فاتح مفتوح سے کس چیز کا طالب ہوتا ہے۔ اور میں فاتح حکمران کا نمائندہ ہوں۔ آپ کے پاس کس غرض سے آیا ہوں؟

ابوعبداللہ: یہ لیجیے چابیاں۔

لاٹ پادری: شکریہ۔ ہمارے حکمران نے پوچھا ہے آپ کب یہاں سے جا رہے ہیں!

ابوعبداللہ: چلا جاؤں گا۔

لاٹ پادری: چلا جاؤں گا نہیں۔ جائیے اور اسی وقت جائیے۔ یہ ان کا حکم ہے۔

ابوعبداللہ: (غصے سے) اپنی اوقات مت بھولو پادری۔

لاٹ پادری: ابوعبداللہ! میں اس کے جواب میں اور کچھ نہیں کہوں گا صرف یہ کہوں گا کہ مجھے میری اوقات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔ آپ شکست کھا چکے ہیں۔ آپ آج بے سہارا اور بے آسرا ہیں۔ آپ ہمارے حکمران کے احکام کے پابند ہیں۔

(ابوعبداللہ کی ماں کی آواز کسی قدر دور سے آتی ہے)

ماں: ابوعبداللہ! بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں جانا ہے۔

ابوعبداللہ: ہاں ہمیں جانا ہے۔

لاٹ پادری: یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کب!

ماں: (دور سے) آج ہی۔

لاٹ پادری: مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔

(ذرا سا وقفہ)

ابوعبداللہ: امی! آپ کو بولنے کی کیا ضرورت تھی؟

ماں: مجھے اس لیے ضرورت تھی کہ میں ابوعبداللہ کی ماں ہوں۔ ایک شکست خوردہ حکمران کی ماں ہوں۔ میرا مقدر تمہارے مقدر سے الگ نہیں ہے۔

ابوعبداللہ: امی۔

ماں : ہمیں آج ہی جانا ہوگا ۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ مگر جانے سے پہلے تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں ۔ اُدھر آؤ میرے قریب ۔ اس کھڑکی میں سے دیکھو۔ صدیوں پہلے کے اس دور کے دھندلکوں میں اُترو جب تمہارے جدامجد امیر عبدالرحمٰن الاول نے یہاں قدم رکھا تھا۔ ماضی کے اندھیرے میں اس درویش کا چہرہ دیکھ رہے ہو وہ آگ اور خون کے دریا میں سے گزر کر ادھر آیا تھا۔ اس نے قرطبہ کی جامع مسجد کا پہلا پتھر رکھا تھا۔ اور اس شخص کو پہچانتے ہو یہ امیر عبدالرحمٰن کا بیٹا ہشام ہے جس نے مزدور بن کر مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا تھا اور مزدور ہی کے لباس کو اپنا کفن بنا لیا تھا ، اور وہ کون شخص کھڑا ہے۔ امیرالمومنین حکم جس نے قحط سالی میں مسجد کے لیے اپنے محل کے سارے قیمتی برتن تک بیچ دیے تھے۔ اور یہ محمد بن عامر۔ دھندلکوں میں اس کا چہرہ کس قدر تابناک ۔ جلیل اور جمیل ہے ۔ اسی نے مسجدِ قرطبہ کو مکمل کیا تھا۔

ابوعبداللہ! تم یہ سب چہرے پہچانتے ہو کیونکہ تم ان کی اولاد ہو۔

(ماں کی آواز بھرا جاتی ہے)

تم ان کی اولاد ہو ابوعبداللہ مگر تم اپنے بزرگوں کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکے۔ تم یہ امانت گنوا بیٹھے ہو ابوعبداللہ۔

(ابوعبداللہ کی سسکیاں ماں کی آواز میں غم و غصہ نمایاں ہو جاتا ہے)

روتے ہو ۔ میں پوچھتی ہوں تمہیں رونے کا کیا حق ہے۔ مردوں کی طرح جس سلطنت کی حفاظت نہیں کر سکے اسے کھو کر عورتوں کی طرح آنسو بہاتے ہو۔ شرم کرو ابوعبداللہ ۔ شرم کرو!

(غمناک موسیقی جو کئی لمحے جاری رہتی ہے ۔ اس کے بعد مؤذن عارف بن زید کی اذان کی آواز اُبھرتی ہے ۔ اذان جاری رہتی ہے کہ لاٹ پادری چلا کر کہتا ہے)

لاٹ پادری : بند کرو یہ آواز۔ آئندہ ایسی جرأت مت کرنا۔

عارف بن زید : کیوں ؟

لاٹ پادری: تمہیں خبر نہیں اذان بند کر دی گئی ہے؟

عارف : اذان بند کر دی گئی ہے مگر کیوں روک دی گئی ہے۔ یہ ظلم ہے۔ تنگ نظری ہے۔ ناانصافی ہے۔

لاٹ پادری: (آواز میں تدبر) ان میں سے کچھ نہیں ہوا۔

عارف : ان میں سے کچھ نہیں ہوا؟ کیا مسجد کے دروازے کھلے ہیں۔ کیا جامع مسجد کے میناروں پر مؤذن اذان دے سکتے ہیں۔ اور کیا آپ نے کسی کو اذان دینے سے نہیں روکا؟

لاٹ پادری: یہ سب کچھ ہوا ہے۔

عارف : آپ نے تو ابھی فرمایا ہے یہ سب کچھ نہیں ہوا۔

لاٹ پادری: تم نے ظلم، تنگ نظری اور ناانصافی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ میری مراد ان سے تھی۔

عارف : لاٹ پادری صاحب! آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

لاٹ پادری: (جلدی سے) تم کون ہو مجھے مخاطب کرنے والے!

عارف : اس مسجد کا ایک مؤذن۔ عارف بن زید۔

لاٹ پادری: ایک مؤذن بھی ہم کو مخاطب کر سکتا ہے؟

عارف : ہر وہ شخص مخاطب کر سکتا ہے۔ جو مؤذن کی آواز پر لبیک کہتا اور اللہ کے حضور حاضر ہوتا ہے اور لاٹ پادری صاحب! میں جس ملت کا فرد ہوں اس میں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میرے مذہب میں مؤذن کی بڑی وقعت اور عزت ہے۔

لاٹ پادری: تم کہنا کیا چاہتے ہو؟

عارف : میں نے آپ سے پوچھا ہے کہ ــــ

لاٹ پادری: آج اس ملک کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ غرناطہ کا آخری حکمران ابوعبداللہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے۔

عارف : ابوعبداللہ جا چکا ہے ۔ اسلام تو نہیں گیا۔ مسلمان اس سرزمین پر موجود ہیں اور ان کے مذہبی فرائض پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔

لاٹ پادری: ہم نے کوئی ایسی پابندی نہیں لگائی۔

عارف : تو مسجد میں داخل ہونے کا جائز حق کس نے چھینا ہے؟

لاٹ پادری: کیوں بار بار مسجد کا نام لیتے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ پہلے پہل یہ مسجد ایک چرچ کی زمین پر تعمیر کی گئی تھی۔ توسیع بعد میں ہوتی رہی ہے۔

عارف : میں خوب جانتا ہوں کہ پہلے پہل یہ مسجد چرچ ہی کی زمین پر تعمیر کی گئی تھی ، مگر میں یہ بھی جانتا ہوں اور میرے ساتھ آپ بھی جانتے ہیں کہ عبدالرحمٰن الداخل نے آپ کی قوم کی پوری رضامندی سے یہ زمین خریدی تھی۔ امیر اندلس نے اس کے عوض اندلس کے تمام پرانے گرجوں کو مرمت کی ذمہ داری قبول کر کے جو کچھ کہا تھا وہ کر کے دکھا دیا تھا۔ صدیوں تک یہاں ہماری حکومت رہی ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کبھی ہمارے کسی حکمران نے آپ کے مذہبی معاملات میں دخل دیا تھا، آپ کی کسی عبادت پر پابندی عائد کی تھی کبھی کسی چرچ کا دروازہ بند کروایا تھا۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ دنیا کے کسی قانون اور اصول کی رُو سے درست نہیں ہے۔

لاٹ پادری: کیا درست ہے اور کیا درست نہیں ہے اس کا فیصلہ کرنا تمہارا نہیں ہمارا کام ہے۔

عارف : آپ جو چاہیں فیصلہ کریں مسجد کا معاملہ ہمارا دینی معاملہ ہے ۔

لاٹ پادری: پھر مسجد۔

عارف : لاٹ پادری صاحب ! آج آپ جس مسجد کا نام سُن کر بار بار غضب ناک ہو جاتے ہیں وہی مسجد ہے جس کے احسانات آپ پر اور دنیا کی قوموں پر ہمیشہ رہیں گے۔ آپ لاکھ اس حقیقت کو چھپانے یا نظر انداز کرنے کی کوشش کریں یہ چھپائی یا نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ جب پورے یورپ میں جہالت کے گہرے اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ اس مسجد سے روشنی کا وہ سیلاب

نکلا تھا جس نے ساری تاریکیوں کو نور میں بدل دیا تھا۔ اس مسجد کی دیواروں کے سائے میں جن لوگوں نے علوم و فنون سیکھنے میں ساری عمریں صرف کر دی تھیں وہی لوگ تھے جنہوں نے اقوامِ عالم کو تہذیب و تمدن کی منور راہوں پر چلنا سکھایا تھا۔ جنہوں نے مُردہ کتابوں کو از سرِ نو زندگی بخشی تھی۔ جنہوں نے اوہام اور بے معنی رسوم و روایات ختم کر کے ان کی جگہ زندگی کی شفاف اور چمکتی دمکتی حقیقتوں کا سبق دیا تھا۔ آپ بھول گئے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ عظیم الشان مسجد تعمیر کی تھی ان کے ذوق و شوق نے اندلس کے چپے چپے کو جنت الفردوس کا نمونہ بنا دیا ہے۔ کتنا ظلم ہے کہ آپ نسلِ انسانی کے ان محسنوں کی اولاد پر ان کی اپنی بنائی ہوئی مسجد کے دروازے بند کر رہے ہیں۔

لاٹ پادری: تمہارے پاس الفاظ کی بہت فراوانی ہے۔

عارف: انہی الفاظ سے میں نے وہ تابناک حقیقتیں بتائی ہیں جنہیں آج آپ کی رعونت تسلیم نہیں کرتی۔

لاٹ پادری: تم کو اپنے عہد میں جو کچھ کرنے کا اختیار حاصل تھا وہ آج ہمیں حاصل ہے۔

عارف: ہم نے سب اختیارات کے ہوتے ہوئے بھی رواداری اور فراخدلی کو ہمیشہ اپنا مذہبی فریضہ جانا تھا ہم نے آپ کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو اپنوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں اس کا ایک ایک دن گواہی دیتا ہے کہ ہم نے اس سرزمین کو اپنا وطن اور اس کے رہنے والوں کو اپنا عزیز گردانا ہے۔ یہ دن تو سینکڑوں نہیں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ لائیے کوئی ایسا دن جس کی پیشانی ہماری ناانصافی کے دھبے سے داغ دار ہے۔ لائیے کوئی ایسی رات جس کی تاریکی تمہاری تاریخ کے اوراق میں منجمد ہو کر رہ گئی ہو۔ ذرا جھانکئے ان صدیوں پر پھیلے ہوئے شب و روز کے اندر اور اپنے کسی عہد کے ایک دروازے کا پتہ دیجئے جسے ہمارے کسی حکمران کے حکم سے بند کر دیا گیا ہو۔ یا ان قدموں کو روک دیا گیا ہو جو کسی معبد کی طرف عبادت کے لیے جا رہے ہوں۔

لاٹ پادری : بالکل فضول سوال ہے۔

عارف : بالکل فضول ہے کیونکہ آپ کا انسانی ضمیر اس کے جواب پر آپ کو شرمندہ کر دے گا۔

لاٹ پادری : موذن! اپنی اوقات مت بھولو۔

عارف : موذن ہونا میرے لیے باعثِ فخر ہے اور میں اپنی اوقات نہیں بھولا۔ اور اس حقیقت کو بھی نہیں بھولا جسے آپ بھول جانا چاہتے ہیں۔

لاٹ پادری : کون سی حقیقت؟

عارف : میں بتا چکا ہوں۔ ظلم۔ ناانصافی۔ تنگ دلی۔

لاٹ پادری : یہ جو کچھ بھی ہے۔ بہر حال ایک حقیقت ہے۔ اُندلس کا موجودہ حکمران یہ نہیں بھول سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔

عارف : اور قرطبہ کی جامع مسجد کا موذن بھی یہ نہیں فراموش کر سکتا کہ اس کا فرض کیا ہے۔ جتنی چاہو رکاوٹیں ڈالو۔ مسجد کے مینار سے اذان بلند ہو گی - ضرور بلند ہو گی۔

دبیز موسیقی۔ اس موسیقی میں سے موذن کی اذان کی آواز اُبھرتی ہے۔ جب وہ کہتا ہے "اشہد ان محمد رسول اللہ" تو اس کی آواز یک لخت رُک جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس پر کاری زخم لگایا گیا ہے اس کی دبی ہوئی آواز آہستہ آہستہ یہ الفاظ دہراتی ہے اور خاموش ہو جاتی ہے۔

مسجد کے اندر ایک سیاح اور اس کا گائیڈ)

گائیڈ : تو جناب! ہم جہاں سے چلے تھے وہیں آ پہنچے ہیں۔

سیاح : ہوں۔

گائیڈ : لگتا ہے مسجد کی فضا نے آپ پر بہت گہرا اثر کیا ہے۔

سیاح : جی۔

گائیڈ : میں نے کہا ہے کہ مسجد کی فضا آپ کے قلب و نظر پر چھا گئی۔

سیاح : ہاں۔

گائیڈ : ایسا ہونا ہی چاہیے تھا میں کئی سال سے گائیڈ کے فرائض ادا کر رہا ہوں اور الحمد اللہ کہ کبھی کبھی جب میں تنہا یہاں آتا ہوں تو میری بھی یہی حالت ہوتی ہے جیسی اس وقت آپ کی ہے۔

سیاح : میں نے بہت لمبا چوڑا سفر کیا ہے۔ کئی یادگار تاریخی عمارتیں دیکھ چکا ہوں اور کئی گائیڈ میری راہنمائی کر چکے ہیں۔ مگر آپ کی باتوں میں میں نے جو دل سوزی پائی ہے وہ اور کہیں نہیں محسوس کر سکا۔ میں نہیں جانتا اس کی وجہ کیا ہے۔

گائیڈ : اس کی ایک وجہ ہے۔

سیاح : کیا! آپ بتائیں گے نہیں؟

گائیڈ : بتانے میں کوئی ہرج نہیں۔ شاید آپ نے یہ واقعہ سنا ہو کہ جب مسجد کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے گئے تھے تو ایک جرأت مند شخص نے لاٹ پادری کو للکارا تھا۔

سیاح : جو اس مسجد کا ایک مؤذن تھا۔

گائیڈ : ایک ایسا مؤذن جس نے بیس برس تک مینار کی بلندی سے توحید کے فرزندوں کو نماز کے لیے پکارا تھا۔ وہ عارف بن زید۔ میرا جدِ امجد تھا۔

سیّاح : آپ اسی مؤذن کی اولاد میں سے ہیں؟

گائیڈ : جی ہاں۔

سیاح : آپ کا رشتہ تو مسجد کے در و بام سے بہت گہرا ہے۔

گائیڈ : بہت گہرا۔

سیاح : معاف کیجیے اب آپ ایک سیّاح کے گائیڈ نہیں۔ بلکہ ہم دو ایسے انسان ہیں جن کا درد مشترک ہے۔ جن کی ذہنی کیفیت کم و بیش ایک سی ہے یہاں گھومنے پھرنے کے بعد میں نے ایسا محسوس کیا ہے جیسے ان دیواروں پر، ان میناروں پر، ان شام صحرا کی طرح بے شمار ستونوں پر ایک بہت گہری، ایک

ناقابلِ بیان اُداسی چھائی ہوئی ہے اور جیسے بیتی صدیاں ایک ابدی سکوت کے غار میں اُتر گئی ہیں۔ کیا یہ کیفیت، یہ ماحول ہمیشہ رہے گا۔ آنے والے کسی دور میں یہاں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی؟

گائیڈ: تبدیلی؟ کون کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔

سیاح: کون کہہ سکتا ہے؟ اور کیا کہہ سکتا ہے۔ مستقبل میں کیا ہوگا۔ کیا ہوگا؟ (ہلکی ہلکی موسیقی جو پانی کے ترنم میں ڈوب جاتی ہے۔ فضا میں دھندلکا۔ موسیقی پس منظر میں چلی جاتی ہے اور علامہ اقبال کی نظم بلند ہوتی ہے)

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب

(وقفہ۔ جس میں کسی اُندلسی لڑکی کا گیت جاری رہتا ہے۔ گیت کی آواز پانی کے شور میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال کی نظم پھر بلند ہوتی ہے)

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

اذان کی آواز۔ یہ آواز بھرپور اور اعتماد انگیز ہے۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

اشھد ان محمد رسول اللہ

اشھد ان محمد رسول اللہ

حی علیٰ الصلوٰۃ

حی علیٰ الصلوٰۃ

حی علیٰ الفلاح

حی علیٰ الفلاح

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

اذان کے آخری لفظوں کے ساتھ فیڈ آوٹ۔

احمد شاہ ابدالی

کردار :-

احمد شاہ ابدالی ————

ذوالفقار ————

نادر شاہ ————

علی زئی ————

جمال خاں ————

عالمگیر ثانی ————

یاقوت خاں

داروغہ

صابر شاہ

ایک سردار

ایک پیغامبر

اور ایک قاصد

○

(شمالی قندھار میں کوہ سلیمان کی بلندی پر احمد شاہ ابدالی کا ایک محل جہاں وہ زندگی کے آخری لمحے گزار رہا ہے)

ابدالی : (آواز میں ضعف) یاقوت خاں!

یاقوت : جی حضور!

ابدالی : کہاں ہو تم؟

یاقوت : حضور کے پاس!

ابدالی : داہنا ہاتھ مجھے دو یاقوت خاں!

یاقوت : یہ لیجیے۔

ابدالی : ہم تم پر بہت خوش ہیں تم نے بڑی محبت سے ہماری رفاقت کا حق ادا کیا ہے۔

یاقوت : حقیر غلام کو اس بات پر فخر ہے کہ حضور نے اُسے اپنی رفاقت کے قابل سمجھا۔

ابدالی : تم نے ہمارا بڑی لمبی عمر تک ساتھ دیا ہے (ہوا کا شور) یاقوت خاں! یہ شور کیسا ہے؟

یاقوت : تیز ہوا چل رہی ہے۔ تُند جھونکے پتھروں سے ٹکراتے ہیں تو شور ہوتا ہے۔ حکم ہو تو کھڑکیاں بند کر دوں!

ابدالی : یاقوت خاں۔ وہ کھڑکی کھلی رہنے دو۔

یاقوت : جیسا حکم!

(وقفہ ہوا کا شور ذرا تھم جاتا ہے)

ابدالی : کوئی آیا تو نہیں ؟

یاقوت : ولی عہدِ سلطنت شہزادہ تیمور آئے تھے۔ حضور نے انہیں واپس بھجوا دیا۔

ابدالی : اور کوئی نہیں آیا؟

یاقوت : نہیں حضور!

ابدالی : اللہ کا شکر ہے۔

یاقوت : حضور! اسے گستاخی نہ سمجھیں تو کچھ عرض کروں!

ابدالی : کہو یاقوت! جو کچھ کہنا چاہتے ہو، بلا خوف کہو۔

یاقوت : حضور! کیا حیرت کا مقام نہیں کہ فاتح اعظم احمد شاہ ابدالی جس کی تلوار کے سائے میں ایک نئے افغانستان نے جنم لیا ہے جس کی ایک آواز سے بھی بڑے بڑے حکمرانوں پر رعشہ طاری ہو جاتا تھا، آج قندھار کے ایک ویران کوہستانی محل میں شدید بیمار پڑا ہے۔ اور اس کے پاس ایک قدیم نمکخوار کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

ابدالی : یاقوت خاں!

یاقوت : ارشاد حضور۔

ابدالی : تمہیں اس سنسان مقام سے خوف آتا ہے تو میں تمہیں یہاں سے چلے جانے کی بخوشی اجازت دیے دیتا ہوں۔ تم جا سکتے ہو یاقوت خاں!

یاقوت : حضور! میرے عرض کرنے کا یہ مقصد تو ہرگز نہیں تھا کہ مجھے اس ویرانے سے خوف آتا ہے۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ آپ ایسے عظیم حکمران کا تنہا ایک محل میں رہنا اور پھر اس علالت کی حالت میں مناسب نہیں ہے۔

ابدالی : ہم نے خود زندگی کے آخری لمحوں کے لیے یہ جگہ پسند کی ہے اور ہم نے یہ بھی پسند کیا ہے کہ زندگی کا یہ آخری حصہ بڑے سکون کے ساتھ بسر کریں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ ہماری مرضی کے عین مطابق ہے۔ ہم یہی چاہتے تھے یاقوت خاں!

یاقوت : گستاخی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔

ابدالی : کوئی بات نہیں۔ ہاں یاقوت خاں!

یاقوت : حضور!

ابدالی : آج جمعۃ المبارک کی رات ہے کیا؟

یاقوت : جی ہاں۔

ابدالی : آدھی رات نہیں گزری۔ ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ رحیلِ کارواں کی آواز گونجنے والی ہے۔ قافلۂ حیات آمادۂ سفر ہو چکا ہے۔

یاقوت : آپ کیا کہہ رہے ہیں میرے بادشاہ!

ابدالی : یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔

یاقوت : (جذبات سے مغلوب ہو کر) میرے بادشاہ!

ابدالی : یاقوت خاں۔

یاقوت : حضور!

ابدالی : یہ بیابان کیسا ہے!

یاقوت : کون سا بیابان حضور!

ابدالی : یہ بے کراں بیابان جو اُفق تا اُفق پھیل گیا ہے۔

یاقوت : حضور، بادشاہ! آپ تو اپنے کوہ سلیمان کے محل میں ہیں۔ یہاں بیابان کہاں؟

ابدالی : یہ میری زندگی کا بیابان ہے۔

یاقوت : آقا! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، آپ کی تو ساری زندگی اسلام کی عظمت کے لیے جنگ و جدل میں گزری ہے۔ آپ کی بدولت آج ملتِ اسلامیہ کا پرچم بلندیوں پر لہرا رہا ہے۔ کون ہے جو آپ کی تابناک زندگی پر ایک ہلکا سا داغ بھی دکھا سکے۔ کس کی زبان آپ کے خلاف شکایت کر سکتی ہے؟ کس کا ہاتھ آپ کا دامن پکڑنے کی جسارت کر سکتا ہے؟

ابدالی: یاقوت خاں! تم پھر جذبات کی رَو میں بہ نکلے ہو۔

یاقوت: حضور! میں سچائی کا اظہار کر رہا ہوں۔

ابدالی: میں نے بہت کچھ کیا۔ مگر اللہ کے راستے میں کیا کیا؟

یاقوت: آپ نے اللہ کے راستے میں کیا کچھ نہیں کیا؟

ابدالی: اس پھیلے ہوئے بیابان میں کہیں نہ کہیں کوئی نخلستان بھی ہوگا۔

یاقوت: آپ کی پوری زندگی ایک گلپوش وادی ہے۔ زمین کا شاداب ترین خطہ ہے۔ ارضی جنت ہے۔

ابدالی: یہ تم کہتے ہو؟

یاقوت: یہ میں کہہ سکتا ہوں کیونکہ میں آپ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب آپ اور آپ کے برادر اکبر ذوالفقار خاں کو میر حسین نے قندھار کے قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر دس برس کی تھی۔

ابدالی: مجھے تو اپنی زندگی میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ۱۱۳۵ھ میں ہرات کے گورنر فردوس آشیاں زمان خاں ابدالی کے گھر میں پیدا ہوا۔ باپ کو اچھی طرح پہچان بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہرات کے نئے گورنر حاجی اسمٰعیل خاں نے میری پرورش کی۔ میرے محترم اور مخدوم نادر شاہ دُرّانی نے مجھ پر بے حد حساب احسان کیے اور اس کے بعد تلواریں چمکتی رہیں اور میں اُن کے سائے میں قدم بہ قدم اُس منزل کی طرف بڑھتا رہا جو آج مجھ سے بہت قریب ہو گئی ہے۔ اور جس کے دروازے پر میں آج دستک دے رہا ہوں۔ میں نے اکاون برس گزارے ہیں۔ اس نصف صدی میں کیا کچھ کیا ہے میں نے؟

یاقوت: میرے بادشاہ نے وہ کچھ کیا ہے جو ایک بہادر بادشاہ پوری صدی میں بھی نہیں کر سکتا۔

ابدالی: نہیں۔

یاقوت: میں ہمیشہ آپ کے بہت قریب رہا ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر آپ

کو کون جانتا ہے ؟

ابدالی : یاقوت خاں! پانی دو۔

یاقوت : لیجئے حضور!

(ذرا سا وقفہ)

جہاں پناہ! پانی! حضور، سو گئے!۔ جہاں پناہ! سو گئے ہیں!۔ بہتر۔ بیماری نے میرے بادشاہ کا سارا خون چوس لیا ہے۔ مگر اس حالت میں بھی چہرہ کس قدر پُر رعب اور پُر عظمت ہے اور پھر کتنا انکسار ہے طبیعت میں! فرماتے ہیں میری پوری زندگی ایک بیابان ہے۔ (وقفہ)

یہ زندگی کیسا بیابان ہے؛ جہاں قدم قدم پر پھولوں کی رنگینیاں بکھریں جہاں بہاروں نے گلفشانیاں کیں۔ جہاں زندگی نے اپنی حقیقی عظمت اور اپنا حقیقی تجمل نچھاور کر دیا۔ غازی دین احمد شاہ ابدالی کو مجھ سے بڑھ کر کون سمجھ سکتا ہے۔ میں انھیں اس وقت سے جانتا ہوں جب۔

(منظر بدلتا ہے۔ قندھار کا جیل خانہ — ذوالفقار اور ابدالی ایک کمرے میں بند ہیں)

ذوالفقار : احمد!

ابدالی : برادر!

ذوالفقار : میرا دل کہتا ہے آج کچھ ہونے والا ہے۔

ابدالی : جو کچھ ہونا ہے ہو جائے۔

ذوالفقار : تم نے دیکھا تھا جب داروغہ ادھر آیا تھا تو اس نے کتنے غور سے تمہیں دیکھا تھا۔

ابدالی : میں نے محسوس نہیں کیا تھا۔

ذوالفقار : آج ضرور کچھ نہ کچھ ہوگا۔

ابدالی : ہونا چاہیے، میں زنداں کی اس تکلیف دہ زندگی سے پریشان ہو گیا

ہوں۔ یا تو میر حسین کا خنجر ہمیں ختم کر دے یا ہم باہر نکل کر اپنے دشمنوں سے جنگ کریں۔ دونوں سے ایک بات ہو جانی چاہیے۔

ذوالفقار : ہو سکتا ہے میر حسین کے آدمی یہاں آئیں اور ہمیں ختم کر دیں۔

ابدالی : آئیں۔ شوق سے آئیں۔

ذوالفقار : کیا کرو گے؟

ابدالی : برادر ذوالفقار! زمان خاں کے بیٹے اور ابدالی قبیلے کے مرد ہو کر پوچھتے ہو۔ کیا کرو گے؟ ہم مقابلہ کریں گے۔

ذوالفقار : وہ تو سینکڑوں کی تعداد میں ہوں گے۔

ابدالی : اس سے کیا ہوگا۔ وہ خنجر جو ہمارے سینوں کے پاس چھپے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں آجائیں گے۔ میر حسین نے سمجھ لیا ہے کہ وہ ہمیں آسانی کے ساتھ اپنے راستے سے ہٹا سکتا ہے مگر ایسا نہیں ہوگا۔

(کسی قدر دُور آہنی دروازہ کھلنے کی آواز)

ذوالفقار : وہ آرہے ہیں۔

ابدالی : آنے دو۔

ذوالفقار : میں اِدھر کھڑا رہوں گا۔ تم دروازے کے پاس چلے جاؤ۔ پہلے مقابلہ میں کروں گا۔ تم نکل جانے کی کوشش کرنا۔

ابدالی : یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اُن کا پوری طرح مقابلہ کروں گا۔

(قدموں کی آہٹ)

ذوالفقار : برادر! اس طرف ہو جاؤ۔ (وقفہ)

داروغہ : تم لوگوں نے خنجر کیوں نکال رکھے ہیں؟

ابدالی : کیا تم نہیں جانتے اِن کا مصرف کیا ہے؟

داروغہ : ان کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ابدالی : یہ خنجر ابدالیوں کی روایت کے پاسباں ہیں۔

داروغہ : خنجر میانوں میں ڈالو اور سُنو۔ سلطان السلاطین جلالت مآب نادرشاہ تم دونوں کو اپنے حضور میں طلب فرماتے ہیں۔

ذوالفقار : (آہستہ) نادرشاہ۔

ابدالی : ہمیں جہاں جی چاہے لے چلو، یہ خنجر ہمارے ہاتھوں ہی میں رہیں گے۔

داروغہ : جلالت مآب کے حضور میں خنجر لے کر جانا سخت توہین انگیز بات ہے۔

ابدالی : اگر انہوں نے واقعی ہمیں طلب فرمایا ہے تو خنجروں کو میانوں میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ نادرشاہ ایک سپاہی ہے اور ہم بھی سپاہی ہیں یہ خنجر سپاہیوں کی نشانیاں ہیں۔

داروغہ : اس حرکت کی ذمّے داری تم پر عاید ہوگی۔ چلو۔

(پکار کر) جلالت مآب! ذوالفقار خاں اور احمد خاں شرفِ باریابی چاہتے ہیں۔

نادرشاہ : بلاؤ۔

ذوالفقار، ابدالی : السلام علیکم۔

نادرشاہ : وعلیکم السلام ہم تم دونوں بھائیوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

ابدالی : شکریہ۔ ہم جلالت مآب کے ممنونِ احسان ہیں کہ آپ نے ہمیں قید خانے سے نجات بخشی۔

نادرشاہ : تمہاری گرفتاری سے ہمیں بہت افسوس ہُوا تھا۔

ذوالفقار : سلطان ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔ خوف تھا کہ میر حسین قبائلی دشمنی کی بنا پر ہمیں قتل کرا دیں گے۔

نادرشاہ : ہم بہت اچھے موقع پر یہاں آگئے ہیں۔

ذوالفقار : دل و جان سے شکریہ۔

نادرشاہ : اب کسی قبیلے کا سردار تمہاری طرف میلی آنکھ سے بھی نہیں

دیکھ سکے گا۔ ہم نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ کہ تم دونوں بھائی اپنی قابلیت کے مطابق کام کرو گے۔ اب کسی سے بھی خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

ابدالی : ہم کبھی کسی سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔

نادرشاہ : شاباش! یہ ابدالیوں کی ہی جرأت و بہادری کا نتیجہ ہے۔ ہماری مہمات کے دوران ابدالیوں کا جو فوجی دستہ ہمارے ہمراہ رہا ہے اُس نے کمال بہادری کے کارنامے دکھائے ہیں۔ ان کارناموں نے ہمارے دلوں پر گہرا اثر کیا ہے اور اب ہم انشاء اللہ تمہارے خاندان کی طرف زیادہ توجہ کریں گے۔

ابدالی : دلی شکریہ۔

نادرشاہ : احمد شاہ!

ابدالی : حضور سلامت۔

نادرشاہ : ہمارے قریب آؤ۔

ابدالی : اس بندہ نوازی کے لیے میں کس طرح شکریہ ادا کروں؟

نادرشاہ : شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور قریب آجاؤ ہمارے۔

ابدالی : جی۔

نادرشاہ : مَیں نے اپنے قابلِ اعتماد افسروں سے تمہاری بہت تعریف سُنی ہے۔ اور اس وقت ہم اپنے سامنے تمہارا چہرہ دیکھ رہے ہیں تو ہم کچھ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ جس بہادر اور عالی حوصلہ نوجوان کا خواب ہم نے ہمیشہ دیکھا ہے وہ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

ابدالی : یہ محض آپ کی ذرہ نوازی ہے۔

نادرشاہ : سُنو! افغانستان کے حالات بہت خراب ہیں۔ نظم و نسق مکمل طور پر بگڑ چکا ہے۔ قبائلی دشمنی کی آگ افغانیوں کے سینوں میں بُری طرح بھڑک رہی ہے۔ ہر ایک سردار ذاتی اقتدار کے لیے اپنے ہی لوگوں کا خون پانی کی طرح بہا رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے خاندان کی سچی روایات کی علمبرداری کرو۔

اور اپنے ذہن کے تدبر اور بازوؤں کی توانائی سے منتشر قوتوں کو ایک مرکز پر لے آؤ۔ ہم جانتے ہیں ابھی تم کم سن ہو۔ مگر عمر کی یہی وہ منزل ہے جب سینوں میں بلند ارادے پرورش پاتے ہیں۔ آج سے تم ایک افسر کی حیثیت سے ہمارے ساتھ رہو گے۔

(منظر بدلتا ہے۔ ابدالی ایک کمرے میں ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے)

ابدالی : کون ؟

صابر شاہ : ابدالی! دروازہ کھولو۔ (وقفہ)

ابدالی : آپ!

صابر شاہ : مجھے پہچانتے ہو ؟

ابدالی : صابر شاہ کو کون نہیں جانتا۔ آپ افغانستان کے روحانی راہنما ہیں اور ہر شخص آپ کے راستے میں آنکھیں بچھانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

صابر شاہ : مجھے اِن باتوں سے کوئی واسطہ نہیں میں صرف ایک درویش ہوں۔

ابدالی : پیرومرشد! آپ آدھی رات کو میرے غریب خانے پر کیوں تشریف لائے ؟ مجھے حکم دیا ہوتا۔

صابر شاہ : مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

ابدالی : فرمائیے ہمہ تن گوش ہوں۔

صابر شاہ : یہ چراغ بجھا دو۔

ابدالی : لیجئے۔

صابر شاہ : ابدالی! آج سے کئی سال پہلے سلطان نادر شاہ نے تمہارے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ تمہیں یاد ہے ؟

ابدالی : جلالت مآب کا ایک ایک لفظ میرے دل پر رقم ہے۔

صابر شاہ : سلطان کے قریب رہ کر تم نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ جو کچھ تمہارے دل پہ رقم ہے اُس پر عمل کرو۔

ابدالی : مجھے ابھی پوری طرح کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔

صابرشاہ : عنقریب ملنے والا ہے۔

ابدالی : وہ کیسے ؟

صابرشاہ : یہ قدرت کے راز ہیں ، اِن میں دخل نہیں دینا چاہیے ، بس یہ سمجھ لو کہ اللہ نے جو فرض تمہارے ذمّے ڈالا ہے۔ اِس کے لیے تمہیں ہر طرح تیار رہنا چاہیے۔

ابدالی : مَیں تیار ہوں۔

صابرشاہ : ابدالی !

ابدالی : پیرومُرشد !

صابرشاہ : جس راہ پر تمہیں چلنا ہے بہت کٹھن ہے۔ قدم قدم پر نوکیلے کانٹے ہیں۔ ہواؤں میں زہر ہے۔ ریت سخت گرم ہے۔ لیکن تمہیں رُکنا نہیں ہوگا۔ آگے ہی آگے بڑھنا ہوگا۔ اگر کہیں تمہارے قدم رُک گئے۔ تم دُنیا کے عیش و آرام میں پڑ گئے تو تم اُن بلندیوں سے نیچے گر پڑو گے جہاں میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ اور جہاں تمہیں ہمیشہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

ابدالی : انشاءاللہ ! مَیں اُنہی بلندیوں پر پرواز کروں گا۔

صابرشاہ : ہمت ، شجاعت ، ایمان و تقویٰ کا دامن تھامے رکھو گے ، تو ایک تاج نہیں دو تاج تمہارے سر پر جگمگائیں گے۔

ابدالی : دو تاج ؟

صابرشاہ : ابھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ لاؤ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔

ابدالی : یہ لیجیے۔

صابرشاہ : یہ تجدیدِ عزم ہے۔ سمجھتے ہو ؟

ابدالی : جی ہاں۔

صابرشاہ : اب چراغ جلا دو۔

ابدالی : پیر و مرشد۔

صابر شاہ : مجھے درویش کہو۔

ابدالی : آپ میرے پیر و مرشد ہیں۔ میں اس بات پر حیران ہوں کہ آپ آدھی رات کو کیوں آئے ہیں؟

صابر شاہ : اس میں تردد مت کرو۔ جو فرض جتنی جلد ادا ہو جائے، بہتر ہے۔

ابدالی : بہتر۔

صابر شاہ : خدا حافظ۔

ابدالی : خدا حافظ۔

(منظر بدلتا ہے۔ مجمع کا شور۔ علی زئی کی پُر جوش آواز اُبھرتی ہے)

علی زئی : بہادر ملتِ افغانیہ! جلالت مآب غازی نادر شاہ کے قتل کا واقعہ ہم سب کے لیے بے حد دردناک ہے۔ جلالت مآب اُس وقت ہم سے رُخصت ہوئے ہیں جب اُن کی سخت ضرورت تھی مگر ہمیں اس بات سے غافل نہیں ہونا چاہیے کہ افغانیوں کی شیرازہ بندی اب ہمارا کام ہے۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ مرحوم بادشاہ نے افغانستان میں اپنا نمائندہ مجھے مقرر کیا تھا اس لیے افغانستان کا انتظام قائم رکھنا اب میرا کام ہے۔

ایک سردار : یہ کام قبیلہ علی زئی یا قبیلہ سدوزئی کے سپرد کیوں نہیں ہو سکتا؟

علی زئی : حاجی جمال خاں کی کیا رائے ہے؟

سردار : آپ کے ساتھ ہے۔

جمال خاں : تو پھر اقتدار کی باگ ڈور میرے قبیلے ہی کو ملنی چاہیے۔

وہی سردار : یعنی محمد زئیوں کو؟

جمال خاں : بالکل۔

سردار : اور قزلباشیوں نے کیا قصور کیا ہے؟

علی زئی : بہادر دوستو! اسی طرح بار بار مشورے ہوتے ہیں اور تقریریں

کے بعد معاملہ وہیں رہتا ہے جہاں اب ہے۔ آج ہم اپنے سردار کا فیصلہ کر کے ہی گھروں کو جائیں گے۔ افغانستان مزید خلفشار برداشت نہیں کر سکتا۔

جمال خاں : تو پھر کس کو سردار بنایا جائے؟

سردار : کس کو؟

علی زئی : بتائیے کس کو؟

(اس موقع پر صابر شاہ کی بڑی بلند آواز گونجتی ہے۔)

صابر شاہ : اس کو جواب تک خاموش بیٹھا رہا؟

علی زئی : شاہ صاحب! کون ہے یہ؟

صابر شاہ : احمد شاہ ابدالی۔

(ایک دم سناٹا)

خاموش کیوں ہو گئے ہو۔ کون ہے تم میں احمد شاہ سے بڑھ کر مدبر۔ منتظم اور مخلص۔ اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہے کہ تم میں جو سب سے اعلیٰ ہے وہی حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے اگر تم اس کو اس کا جائز حق نہیں دو گے تو افغانستان کی عظمت و جلال کا رفیع مینار آن کی آن میں سرنگوں ہو جائے گا۔ بولو کون ہے جو اس انتخاب کے خلاف آواز اٹھاتا ہے؟ کون اپنے آپ کو اس سے بہتر سمجھتا ہے؟ بولو کس کی آواز میرے فیصلے کے خلاف بلند ہو سکتی ہے؟ بولو ــــ بولو۔

سردار : (آہستہ سے) شاہ صاحب درست فرماتے ہیں۔

علی زئی : (آہستہ) جمال خاں تم کیا کہتے ہو؟

صابر شاہ : میں تمہارے فیصلے کا انتظار کر رہا ہوں۔

(بلند آواز میں)

جمال خاں : شاہ صاحب۔ میں آپ کی پُر زور تائید کرتا ہوں۔

سردار : اور میں بھی تائید کرتا ہوں۔

(ہم تائید کرتے ہیں" کی آوازیں، ہجوم سے بلند ہوتی ہیں)

صابر شاہ : احمد شاہ!

ابدالی : پیر و مرشد!

صابر شاہ : تم نے قوم کا فیصلہ سن لیا ہے؟

ابدالی : جی ہاں!

صابر شاہ : قوم نے تمہیں بہت بڑی عزت دی ہے اور اس عزت کی وجہ سے ہم تمہیں "دُرِّ دوراں" کہتے ہیں۔ دُرِّ دوراں ــــ احمد شاہ ابدالی۔

ابدالی : پیر و مرشد۔ آپ نے مجھے "دُرِّ دوراں" کا خطاب دے کر زمین سے آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ میں اس خطاب کی مناسبت سے اب اپنے قبیلے کو ابدالی کی بجائے درانی کہوں گا اور آج سے میں بھی احمد شاہ ابدالی کی بجائے احمد شاہ درانی ہونے پر فخر کروں گا۔

صابر شاہ : اللہ کی رحمتیں تم پر سایہ افگن ہوں۔

مجمع : آمین۔

جمال خاں : احمد شاہ مبارکباد!

ابدالی : شکریہ۔

سردار : میرے تمام قبیلے کی طرف سے مبارکباد۔

ابدالی : آپ کے تمام قبیلے کا شکریہ۔

(یہاں سے خوشی کی موسیقی شروع ہو جاتی ہے جو بتدریج بڑھتی جاتی ہے اس میں سے ابدالی کی آواز ابھرتی ہے)

ابدالی : کیا ہے یاقوت خاں؟

یاقوت خاں : عالی جاہ! دربار ہند سے ایک پیغام بر آیا ہے۔

ابدالی : کس کی طرف سے؟

یاقوت خاں : لاہور کے گورنر شاہ نواز خاں کی طرف سے۔

ابدالی : بلاؤ۔ (وقفہ)

پیغامبر : بادشاہ افغانستان کی خدمت میں لاہور کے گورنر شاہ نواز خاں سلام محبت پیش کرتے ہیں۔

ابدالی : خوش آمدید۔

پیغامبر : میرے آقا نے یہ تحریر بھیجی ہے اور ایک زبانی پیغام بھی دیا ہے۔

ابدالی : زبانی پیغام کیا ہے؟

پیغامبر : میرے آقا نے کہا ہے کہ ہندوستان کے درودیوار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ آخری سانس لے رہا ہے۔ امراء، وزرا طرح طرح کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ فوج کی تنظیم ختم ہو چکی ہے۔ یہ حملے کے لیے بہترین موقع ہے۔ اگر اس موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے تو جس طرح آپ کے محترم بزرگ نادر شاہ نے ہندوستان کو اپنے قدموں پر جھکا لیا تھا آپ بھی اپنی فتح مندی کا پرچم دہلی کی فضاؤں میں بلند کر سکتے ہیں۔ مجھ پر آپ پورا پورا اعتماد کریں۔ میرے تمام ذرائع آپ کے لیے وقف ہیں۔ جواب کے لیے ہیں ہمہ تن گوش ہوں۔

ابدالی : اور تحریر کیا ہے؟

پیغامبر : تحریر میں حملے کے اوقات اور ترتیب کا ذکر کیا گیا ہے عالم پناہ

ابدالی : پیغامبر!

پیغامبر : عالی جاہ۔

ابدالی : تمہارے آقا کے سلام محبت کا جواب ہم سلام محبت ہی کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ جاؤ ان سے کہہ دو کہ ہم پابہ رکاب ہیں۔

پیغامبر : حضور سے اسی بات کی توقع تھی۔ لاہور کے گورنر آپ کے اس جواب سے بہت خوش ہوں گے، میں اُن کی طرف سے دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(ذرا سا وقفہ)

ابدالی : یاقوت خاں!

یاقوت خاں: حضور!

ابدالی: ہم خود بھی اس دن کا انتظار کر رہے تھے، فردوس مکاں نادر شاہ کے جانشین ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ان علاقوں کو دوبارہ فتح کریں جو نادر شاہی سلطنت کا حصہ بن چکے تھے۔

یاقوت: عالی جاہ! میں ہندوستان کی سرزمین میں افغانی شاہ سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپیں سن رہا ہوں اور درانی پرچم کو فضا میں پرفشاں محسوس کرتا ہوں مگر...

ابدالی: کہو یاقوت! کیا کہنا چاہتے ہو؟

یاقوت: ہندوستان میں جابجا خانہ جنگی ہو رہی ہے۔

ابدالی: ہم اس خانہ جنگی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

یاقوت: یہ درست ہے حضور!

ابدالی: یاقوت! جو کچھ تمہارے دل میں ہے، وہ ہم بخوبی جانتے ہیں۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ شاہ نواز خاں نے ہمیں اس لیے دعوت نہیں دی کہ وہ ہمارا دوست ہے یا اُسے ہماری فتح مندیوں کی آرزو ہے۔ وہ ہمیں صرف اس لیے بُلا رہا ہے کہ ہم اُس کی مدد کریں اور اس کے دشمنوں کو شکست دے کر اُس کی سلطنت وسیع کریں۔

یاقوت: حضور مجھ سے بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں۔

ابدالی: ہم جانتے ہیں ایسے لوگ اپنے ارادے کے پکے نہیں ہوتے کسی وقت بھی اپنے قول و قرار سے منحرف ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ بخوبی جانتے ہیں مگر جو کچھ کہہ چکے ہیں۔ وہ چٹان کی طرح اٹل ہے۔

یاقوت: حضور بہتر جانتے ہیں۔

ابدالی: (زور دار لہجے میں) یاقوت! ہم ضرور ہندوستان پہ چڑھائی کریں گے اور اپنی قوت بازو سے یہ ملک فتح کریں گے۔ کسی کی سازش ہم پہ مطلقاً اثر انداز نہیں ہو گی۔ جو تلوار نادر شاہ کے ہاتھ میں چمکی تھی، وہ آج ہمارے ہاتھ میں ہے۔

کوئی طاقت یہ تلوار ہمارے ہاتھ سے نہیں چھین سکتی، کوئی دیوار ہمارا راستہ روک نہیں سکتی! انشاء اللہ تعالیٰ ہم ایک مہیب طوفان بن کر ہر جگہ، ہر مقام، ہر خطے پر چھا جائیں گے۔

(موسیقی، چڑیوں کے چہچہے صبح کے آثار جو گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے تک قائم رہتے ہیں اور پھر ان کے شور میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ ہنگامہ جنگ آدھ منٹ تک جاری رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ مدھم ہو جاتا ہے)

یاقوت : عالی جاہ! مبارک ہو، ہندوستان کی آدھی سرزمین کو آپ کی بہادر اور جانباز فوجوں نے روند ڈالا ہے، دہلی کا تخت آپ کی راہ دیکھ رہا ہے۔

ابدالی : دہلی کا تخت ہماری راہ دیکھ رہا ہے۔

یاقوت : مغل حکمران عالمگیر ثانی آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔

ابدالی : یاقوت ہماری طرف سے انہیں پیغام بھجوا دو کہ ہم ان کا وزیر آباد میں انتظار کر رہے ہیں۔

یاقوت : حضور! آپ دہلی فتح کرنے کے باوجود وہاں نہیں جائیں گے؟

ابدالی : ہم نے جو کچھ کہا ہے، اس پر عمل کرو اور سنو، ہم عزت و احترام کے ساتھ بادشاہِ دہلی کا خیر مقدم کریں گے۔ خاطر خواہ انتظام ہونا چاہیے۔

یاقوت : جیسا حکم۔ (موسیقی)

ابدالی : خوش آمدید! ہمارے معزز مہمان کو یہاں آنے میں زحمت ہوئی۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔

عالمگیر ثانی : ہم اسے عزت افزائی سمجھتے ہیں۔

ابدالی : تشریف رکھیے۔

عالمگیر ثانی : شکریہ۔

ابدالی : اس سے پہلے کہ ہم کچھ اور کہیں، آپ کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ ہمیں دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کی کوئی آرزو نہیں۔ دہلی کا تخت و تاج

آپ کو مبارک ہو۔

عالمگیر ثانی : ہم نے افغان حکمران کو جیسا شاد دیسا پایا ہے۔ اس حُسنِ سلوک نے ہمارے دل پر وہ نقش ڈالا ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔ ہم اس کے بدلے اپنی دلی محبت کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔

ابدالی : ہم یہ تحفہ قبول کرتے ہیں اور تجویز کرتے ہیں کہ اس محبت کا عملی ثبوت بھی پیش کریں۔

عالمگیر ثانی : وہ کس طرح ؟

ابدالی : دستار بدل بھائی بن کر۔

عالمگیر ثانی : اس سے زیادہ مسرت انگیز بات ہمارے لیے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ایسے حکمران کے بھائی بنیں جس کی محبت سمندر کی طرح بے کراں اور جس کی ہیبت پہاڑ کی طرح ناقابلِ شکست ہے۔ آپ کی دستار ہمیں وہ سربلندی عطا کرے گی جس پر نہ صرف ہم بلکہ ہماری اولاد بھی ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔

(مسرت انگیز موسیقی)

ابدالی : کون ہے اُدھر!

یاقوت : مَیں ہوں جناب۔

ابدالی : تم باتیں کس سے کر رہے تھے ؟

یاقوت : ایک شخص ہے۔

ابدالی : کوئی ہے یہ جو ہم سے ملنا چاہتا ہے۔

یاقوت : مَیں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ حضور جب سے کابل سے واپس آئے ہیں علیل ہیں۔ اس وقت آرام کر رہے ہیں آج نہیں مل سکتے۔

ابدالی : تم نے اُس سے یہ بات کیوں کہہ دی ہے ؟

یاقوت : عالیجاہ! جب تک آپ ہندوستان میں رہے مسلسل جنگ و جدل میں مصروف رہے۔ اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔

ابدالی : ہمیں آرام کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیا خبر وہ شخص کتنا ضروری پیغام لایا ہوگا۔ کس نے بھیجا ہے اُسے؟

یاقوت : شاہ ولی اللہ نے۔

ابدالی : شاہ ولی اللہ۔ اس نام کی ہمارے دل میں بڑی عزت و منزلت ہے۔ شاہ صاحب کا قاصد آئے اور ہم فی الفور اس سے نہ ملیں یہ ہماری بد بختی ہے۔ یاقوت! اسے فوراً بلاؤ۔

یاقوت : بہتر حضور! (وقفہ)

لیجیے! حاضر ہو گیا ہے۔

قاصد : السلام علیکم۔

ابدالی : وعلیکم السلام ہمیں ندامت ہے کہ تمہیں تکلیف ہوئی۔ تمہارے آنے کی ہمیں ابھی اطلاع ملی ہے۔

قاصد : عالی جاہ! مجھے شاہ ولی اللہ محدثِ دہلی نے حضور کی خدمت میں بھیجا ہے اور آپ کے نام جو پیغام دیا ہے وہ میں پڑھ کر سناتا ہوں۔

ابدالی : سناؤ۔

قاصد : شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"محافظِ ملتِ اسلامیہ! اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔ گزارش یہ ہے کہ اس وقت کشورِ ہندوستان میں مسلمانوں کی عزت اور ان کا ننگ و ناموس سخت خطرے میں ہے۔ مرکزی حکومت مضمحل ہو چکی ہے۔ اسلام کے دشمن جگہ جگہ سر اُٹھا رہے ہیں۔ سب سے زیادہ آفت مرہٹوں نے برپا کر رکھی ہے۔ اللہ نے آپ کو طاقت دی ہے۔ اپنی طاقت سے کام لے کر ان بد اندیش دشمنانِ دین کا قلع قمع کر دیں۔ اگر اس وقت تغافل سے کام لیا گیا تو مرہٹے تمام کشورِ ہندوستان پر پھیل کر اقتدار کے مالک بن جائیں گے۔

ابدالی : کچھ اور بھی کہا ہے انہوں نے؟

قاصد : انہوں نے صرف یہی پیغام دیا ہے۔ البتہ ہندوستان میں آپ کے نمائندے نجیب الدولہ نے کہا ہے کہ ہمارے حالات بہت تشویشناک صورت اختیار کر گئے ہیں اور انہوں نے بھی آپ سے یہی درخواست کی ہے۔

ابدالی : مرہٹوں کی دست درازیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔

قاصد : حضور! ان کی قوت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور وہ دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

ابدالی : تم واپس کب جا رہے ہو؟

قاصد : مجھے صرف یہ پیغام حضور تک پہنچانا تھا۔ یہ فرض میں نے ادا کر دیا ہے اب میں ایک لمحے کے لیے بھی یہاں نہیں ٹھہروں گا۔

ابدالی : شاہ صاحب تک یہ اطلاع پہنچا دو کہ ابدالی اسلام کا ادنیٰ خادم ہے اور وہ پوری قوت کے ساتھ مرہٹوں سے جنگ کرے گا اور ان کی تمام سازشوں کو خاک میں ملا دے گا۔

قاصد : میں اسی وقت روانہ ہو جاتا ہوں۔

ابدالی : ہم تمہارے پیچھے ہی آ رہے ہیں۔

(میدانِ جنگ، گھوڑوں کی ٹاپیں۔ ابدالی اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہے)

ابدالی : بہادرو! آج اس میدان میں جسے پانی پت کا میدان کہتے ہیں حق و باطل کا ایک عظیم معرکہ برپا ہونے والا ہے۔ باطل اپنی قوتوں کو جمع کر کے ہمارے سامنے لے آیا ہے اور اس ناپاک ارادے کے ساتھ آیا ہے کہ سچائی سے ٹکرا کر اُسے ہمیشہ کے لیے بے دست و پا کر دے مگر اس کا یہ خیال ایک خیالِ خام ہے اور اس وقت تک خام رہے گا جب تک اللہ کے مجاہدوں کے دلوں میں ایمان کی قوت اور ان کے ہاتھوں میں اسلام کی تلوار چمک رہی ہے۔ اس میدان میں آج پہلی مرتبہ معرکہ آرائی نہیں ہو رہی اس خاک سے کئی طوفان گزر چکے ہیں۔ اس میدان کی پھیلی ہوئی وسعتوں میں انگنت بجلیاں کوندہ چکی ہیں اور اس مٹی کے ذروں میں جاں نثاروں کے مقدس لہو نے

بارہا چراغ روشن کیے ہیں۔ جاں نثارو! تمہارے بازو ملت کی عظمت کے پرچم بردار تمہارے سینے جذبۂ صداقت کے امین اور تمہاری تلواریں قوم کے ننگ وناموس کی محافظ ہیں۔ آج تمہارا فرض تمہیں کھینچ کر یہاں لایا ہے۔ ثابت کردو کہ اس فرض کے راستے میں کوئی قوت بھی ٹھہر نہیں سکتی۔ جو طاقت بھی تمہارے آگے آئے گی آن کی آن میں ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

(بگل پر مارچ ٹیون جنگ و جدل کے تاثرات۔ جنگ کا ہنگامہ تیزی سے بڑھتا جائے گا)

ابدالی: اعظم خاں! اپنا دستہ ادھر لے آؤ۔ جلیل خاں پیچھے ہٹ جاؤ۔ عثمان! سنبھالو اپنے سپاہیوں کو، آگے بڑھو، شاباش! چلتے جاؤ، بڑھتے جاؤ۔ تیزی سے گولہ باری کرو۔ تمام توپوں کو حرکت میں لے آؤ۔ عثمان! رک کیوں گئے ہو؟ آگے بڑھو! چلو ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ میرے پیچھے چلو۔ دیواروں میں شگاف پڑ چکے ہیں۔ کانپنے لگی ہیں شاباش۔ غازیو! بہادرو، شاباش! شاباش، شاباش۔ بس آخری حملہ پوری قوت کے ساتھ!

(جنگ تیز ہو جاتی ہے اور ایک منٹ تک جنگ کا ہنگامہ برپا رہتا ہے۔

اسی اثنا میں دور سے مؤذن کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اللہ اکبر یہ آواز بتدریج مدھم ہوتی ہے۔)

ابدالی: اللہ اکبر! اللہ اکبر، اللہ بلند و برتر اللہ! جس نے پانی پت کے میدان میں مسلمانوں کو فتح دی۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

(وہی کمرہ جس میں ابدالی زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے۔ اس کی کمزور و نحیف آواز ابھرتی ہے)

ابدالی: یاقو۔ت۔ خان۔ یاقوت۔ یاقوت خان۔

یاقوت: کہیے میرے بادشاہ۔

ابدالی: تم کیا کہہ رہے تھے؟

یاقوت: حضور کی آنکھ لگ گئی اور میں پچھلے واقعات یاد کرتا رہا۔

ابدالی : پچھلے واقعات؟

یاقوت: جی ہاں۔ سارے واقعات میرے حافظہ میں یکے بعد دیگرے ابھرتے رہے۔

ابدالی : اور ہم نے خواب میں دیکھا کہ ہم دوبارہ اس مقدس مقام پر پہنچ گئے ہیں۔

یاقوت: کون سے مقدس مقام پر حضور؟

ابدالی : جہاں پانی پت کی فتح کے فوراً بعد گئے تھے۔ وہ مقدس مقام جہاں پانی پت کا ولی اپنے انوار پھیلا رہا ہے۔

یاقوت: آپ بوعلی قلندرؒ کے روضۂ اقدس پر گئے تھے۔

ابدالی : اس منظر کی یاد ہمارے دل کو کتنا سکون دے رہی ہے۔ کتنا اطمینان بخش رہی ہے۔

یاقوت: آپ گئے تھے بڑے احترام کے ساتھ بڑے ادب کے ساتھ۔

ابدالی : اس سرکار میں احترام اور ادب ہی سے جانا چاہیے تھا۔

یاقوت: برہنہ پا تھے، آنکھوں میں آنسو تھے، ہاتھ اُٹھے ہوئے تھے۔ اور آپ کہہ رہے تھے ——

ابدالی : میں کہہ رہا تھا یا بوعلی قلندرؒ! میرے لیے اللہ سے دعا کیجئے کہ دُنیا اور آخرت میں عزت و آبرو رہے۔ آخرت میں عزت و آبرو رہے۔ آخرت میں عزت رہے۔ اے ربِ کریم! اے ربِ جلیل تیری بارگاہ میں آرہا ہوں۔ تیری رحمتوں کا اُمیدوار ہوں۔ ربِ کریم، ربِ جلیل تیری رحمتوں کا آرزومند ہوں۔

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

(ابدالی کی آواز ڈوب جاتی ہے۔)

یاقوت : میرے بادشاہ۔ میرے آقا!! میرے آقا۔

(دردناک موسیقی)

حضرت محل

کردار:-

حضرت محل ——————

علی محمد ——————

رحمت علی ——————

جنرل اوٹرم ——————

انا ——————

دلاور ——————

کمبل پوش

اطلاعچی

بشن پرشاد

شہزادہ برجیس قدر

فرخندہ محل

بال کرشن

○

(موسیقی۔ جس کا ڈرامے کے ساتھ آغاز ہوتا ہے۔ بتدریج مدھم ہوتی ہوئی اُس مقام پر پہنچ جاتی ہے کہ سناٹے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایسے میں ایک کڑکتی ہوئی نسوانی آواز گونج اٹھتی ہے)

حضرت محل : ٹھہرو۔ کون ہو تم؟

کمبل پوش : مجھے حضرت محل سے ملنا ہے۔

حضرت محل : رات کے پچھلے پہر شاہی محل میں آنے کی تمہیں کیونکر جرأت ہوئی؟

کمبل پوش : میں اسی وقت یہاں آسکتا تھا۔

حضرت محل : کیا مقصد ہے تمہارا؟

کمبل پوش : وہ مقصد ہے جو مجھے بھی بہت عزیز ہے اور تمہاری بیگم صاحبہ کو بھی۔ انہیں فوراً اطلاع دو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔

حضرت محل : (آواز میں پہلی سی تندی اور تیزی نہیں) نام کیا ہے تمہارا؟

کمبل پوش : یہ میں خود بیگم صاحبہ کو بتاؤں گا۔

حضرت محل : مجھے بتاؤ۔

کمبل پوش : میرا نام آغا مرزا ہے۔

حضرت محل : آغا مرزا۔ یعنی کمبل پوش۔

کمبل پوش : ہاں۔ کمبل پوش۔

حضرت محل : آپ واقعی کمبل پوش ہیں؟

کمبل پوش : اگر کمبل پوش نہ ہوتا تو اس وقت شاہی محل میں پہنچنے کی کیونکر

جسارت کر سکتا تھا؟

حضرت محل: آپ کو حضرت محل سے کیا کہنا ہے؟

کمبل پوش: جو کچھ مجھے کہنا ہے انہیں سے کہوں گا۔ کسی اور سے نہیں۔

حضرت محل: تو فرمایئے!

کمبل پوش: آپ حضرت محل ہیں؟

حضرت محل: جی ہاں۔

کمبل پوش: بیگم صاحبہ، رات کی تاریکی میں آپ محل کے دروازے پر کیا کر رہی ہیں؟

حضرت محل: مجھے اطلاع ملی تھی کہ انگریزوں کے ریذیڈنٹ جنرل اوٹرم کے سپاہی رات کے وقت محل کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اُن لوگوں کی حرکات و سکنات کیا ہیں۔ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟

کمبل پوش: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟

حضرت محل: جانتی ہوں سب کچھ جانتی ہوں۔ میں نے محل کے محافظوں کو حکم دیا تھا کہ فرنگی سپاہی محل کے پاس نظر آئیں تو انہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے۔

کمبل پوش: بیگم صاحبہ! آپ کے محافظ باغ کے کسی گوشے میں سو رہے ہوں گے۔

حضرت محل: اس قدر فرض ناشناس ہیں وہ؟

کمبل پوش: سپاہی اپنے فرض کو کیوں نہ بھولیں جب کہ تاجدارِ اودھ نے خود سب سے زیادہ فرض ناشناسی کا ثبوت دیا ہے۔ معاف کیجئے۔ بیگم صاحبہ میں نے صرف اس حقیقت کا اظہار کیا ہے جو خدا نہ کرے ہندوستان کی تاریخ کا ایک شرمناک باب بن جائے۔

حضرت محل: میں آپ کی عزت کرتی ہوں کہ آپ وطن کے لیے ایک غیر ملکی طاقت سے ٹکرا رہے ہیں مگر ـــــ

کمبل پوش: میں بھی آپ کا انتہائی احترام کرتا ہوں۔ کہ آپ کو اپنے وطن سے

سچی محبت ہے اور چاہتی ہیں کہ اس غیر ملکی طاقت کا منحوس سایہ یہاں سے ہمیشہ کیلئے چلا جائے، لیکن بیگم صاحبہ آپ فرماں روائے اودھ کو اپنے شوہر کی حیثیت سے نہ دیکھئے۔ اس حیثیت سے دیکھئے کہ حکمران ہونے کی حیثیت سے اُن پر کیا فرض عائد ہوتا تھا۔ اور یہ فرض انہوں نے کہاں تک نبھایا ہے، قدرت نے انہیں قیصر باغ سے نکال کر اور مٹیا برج میں بھیج کر اس بات کا موقع دیا تھا کہ وہ عبرت حاصل کریں اور اپنے ملک پر اجنبی تسلط کے خاتمے کے لیے اپنی ساری کوششیں وقف کر دیں۔ مگر وہاں جا کر بھی راگ رنگ کی وہی محفلیں جاری ہیں۔

حضرت محل: جانتی ہوں۔

کمبل پوش: لیکن میں یہ باتیں سُنانے کے لیے یہاں نہیں آیا۔

حضرت محل: تو کیا سنانے کے لیے آئے ہیں؟

کمبل پوش: اگر میں یہ نہ جانتا کہ آپ کیا ہیں اور کیا کر سکتی ہیں تو ادھر آنے کا تصور بھی نہ کرتا۔ آپ ہماری اُمیدوں کا مرکز ہیں۔

حضرت محل: میں کیا کر سکتی ہوں؟

کمبل پوش: بیگم صاحبہ! آپ کے دل میں جو مقدس آگ جل رہی ہے۔ اس کی چنگاریاں اُڑ اُڑ کر ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی ہیں اور یہ اُنہی چنگاریوں کا اثر ہے کہ آج ہزاروں سینے شعلہ فشاں ہو گئے ہیں۔ یہ محبانِ وطن غلامی کی زنجیریں کاٹ دینے اور ناموسِ وطن پر کٹ مرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ میرے پاس دو سو سپاہی ہیں۔ اور یہ سب سپاہی وطن کے نام اور آپ کے نام کی قسم کھا کر عہد کر چکے ہیں کہ زندگی کے آخری سانس تک فرنگیوں سے لڑیں گے۔

حضرت محل: میرا اسلام ہو اُن بہادروں کو۔

کمبل پوش: میں نے سُنا ہے کہ آپ شہزادہ والا قدر کو اودھ کا حکمران بنا کر خود اُس کی سرپرست بن رہی ہیں۔

حضرت محل: ابھی شہزادے کی عمر ہی کیا ہے۔ اس لیے میرا سرپرست

بنا ضروری ہے مگر بیگمات اس کی شدید مخالفت کر رہی ہیں۔

کمبل پوش : کیوں؟ مخالفت کی وجہ؟

حضرت محل : وہ فرنگی اقتدار سے خوفزدہ ہیں۔ سمجھتی ہیں کہ اگر شہزادے کے حکمران ہونے کا اعلان کیا گیا تو انگریز ناراض ہو جائیں گے۔

کمبل پوش : حیرت ہے کہ بیگمات اس طرح سوچ رہی ہیں۔ کیا آپ کی مثال اُن کے سامنے نہیں ہے؟

حضرت محل : درونِ خانہ وہ میری بھی مخالف ہیں۔ اُنہیں خدشہ ہے کہ میری سرگرمیوں سے فرنگی پورے شاہی خاندان کے دشمن ہو جائیں گے۔

کمبل پوش : اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیں۔

حضرت محل : چھوڑ دینا ہوگا۔

کمبل پوش : بیگم صاحبہ! اگرچہ ملک میں پست ہمتی عام ہے۔ لوگ سہمے سہمے سے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود میرے ہم وطنوں کا ایک بہت بڑا گروہ ان فرنگیوں سے سخت نفرت کرتا ہے اور آزادیٔ وطن کے لیے ہر وقت اپنی جانیں قربان کر سکتا ہے۔ ضرورت صرف ایک ایسی آواز کی ہے جو ان وطن پرستوں کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرے۔ اور آپ کی ذات یہ فرض بخوبی انجام دے سکتی ہے۔

حضرت محل : میں یہ فرض ہر قیمت پر ادا کروں گی۔

کمبل پوش : آواز بلند کیجیے، سب سے پہلے میرے سپاہی آپ کی آواز پر لبیک کہیں گے۔ خدا آپ کی مدد کرے۔

(کمبل پوش کا آخری فقرہ ذرا فاصلے سے سنائی دے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رخصت ہو رہا ہے۔ وہ تین لمحے خاموشی رہے گی)

حضرت محل : —— (کمبل پوش کا فقرہ دہراتی ہے) خدا آپ کی مدد کرے۔

(آواز جذباتی ہونے لگتی ہے)

خدائے قدوس! میری مدد کر۔ میری راہنمائی کر ان کمزور بازوؤں کو طاقت دے۔

اس دل سے سب کچھ نکال دے۔ سب کچھ نکال دے صرف ایک چیز رہنے دے، وطن کی محبت، وطن کے لیے قربان ہونے کی آرزو۔ خدائے عز و جل! اس ناچیز حقیر بندی کو توفیق دے کہ سارے فرنگیوں سے لڑکر انہیں ملک سے نکل جانے پر مجبور کردوں۔ یہ وطن ہمارا ہے ہمارا پیارا۔ ہمارا عزیز وطن ہماری جانیں اس پر قربان ہوں۔ ہمارا سب کچھ اس پر قربان ہو جائے مگر وطن آزاد در وکر، ہو جائے خدائے رحیم خدائے کریم۔ میری پکار سن۔ میری پکار سن خدائے رحیم!

(آخر میں آواز بھرا جاتی ہے۔ موسیقی کے ساتھ تبدیلی منظر ہوتا ہے)

علی محمد: سلامتی ہو، بیگم صاحب پر۔ کس لیے یاد فرمایا گیا ہے مجھے؟

حضرت محل: علی محمد، تم کو معلوم ہو چکا ہے کہ شہزادے کی تخت نشینی کی مخالفت تمام بیگمات نے کی ہے۔

علی محمد: میں جانتا ہوں۔

حضرت محل: ہماری سپاہ کا کیا خیال ہے؟

علی محمد: سپاہ آپ کے ساتھ ہے۔

حضرت محل: اور ہم بھی اپنے بہادر سپاہیوں کے ساتھ ہیں۔ ہم نے طے کر لیا ہے کہ آج ہی شہزادے کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ سارا انتظام ہم خود سنبھال لیں گے۔ علی محمد خاں تمہاری ذات پر ہمیں ہر طرح اعتماد ہے۔ ہمیں پورا پورا یقین ہے کہ تم ہمیشہ ہمیں نیک مشورے دیتے رہو گے۔

علی محمد: بندہ اپنے خون کا ہر قطرہ وطن کی آزادی پر بہانے کے لیے تیار ہے!

حضرت محل: ہمیں تم سے یہی توقع ہے۔

علی محمد: مگر بیگم صاحبہ حضور! جو کچھ میں دیکھ آیا ہوں آپ سے عرض کرنا ضروری ہے۔ اس وقت قیصر باغ کے باہر فرنگی ایک طرف تو اپنی فوجی تنظیم مضبوط کر رہے ہیں۔ تاکہ بادشاہ دہلی کو تخت سے اُتار دیں اور دوسری طرف وہ ایسے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا رہے ہیں جو ہیں تو ہمارے ہم وطن مگر جن کا ضمیر ایک فروخت ہو جانے

والی جنس بن کر رہ گیا ہے۔ ملک کے پورے ماحول میں ریشہ دوانیاں پرورش پا رہی ہیں۔ آزادی کے عوض غلامی کی خریداری ہو رہی ہے۔

حضرت محل: ایسے میں تمہارا مشورہ کیا ہے؟

علی محمد: آپ کو آگ اور خون کے دریا سے گزرنا ہوگا۔

حضرت محل: ہم اس کے لیے تیار ہیں۔

علی محمد: تو اسی وقت بادشاہ دہلی کو اودھ کی آزادی پر مبارک باد کا پیغام بھجوانے کا حکم دے دینا اچھا ہے۔

حضرت محل: اجازت ہے۔

علی محمد: اور حضور دوسری عرض یہ ہے کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شہزادے کی تخت نشینی کا اعلان کروا دیں۔

حضرت محل: یہ بہت ضروری ہے۔

(اعلانچی زنگ کر اعلان کرتا ہے۔ منظر بدلتا ہے۔)

اعلانچی: خلق خدا کی، ملک بادشاہ دہلی کا۔ اور حکم میرزا برجیس قدر بہادر کا۔ سنو لوگو! ایک بے حد اہم اعلان کیا جاتا ہے۔ ملکہ عالیہ حضرت محل کے فرزند ارجمند میرزا برجیس قدر بہادر نے اودھ کے تخت پر نزولِ اجلال فرمایا ہے اور ملکہ عالیہ اُن کی سرپرست رہیں گی۔ خلق خدا کی ملک بادشاہ دہلی کا اور حکم میرزا برجیس قدر کا۔

(اعلانچی کی آواز۔ توپوں کی گرج میں دب جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی "مبارک مبارک" کا شور بلند ہوتا ہے جو تیزی سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ شور بتدریج ختم ہو جاتا ہے۔ جب شور پوری طرح ختم ہو جاتا ہے۔ تو منظر بدلتا ہے)

بشن پرشاد: ہنس رہے ہو رحمت! یہ موقع ہنسی کا ہے؟

رحمت علی: بشن! مجھے ہنسی اس بات پر آ رہی ہے کہ ہمارے جنرل اوٹرم نے سمجھا تھا حضرت محل ایک پردہ نشین عورت ہے۔ پہلی ہی بھپکی پر ڈر جائے گی۔ مگر یہ عورت تو شیرنی نکلی ہے۔

بشن پرشاد : واقعی کمال کر دیا ہے اس عورت نے ۔

رحمت علی : کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ واجد علی کے قیصر باغ میں جہاں بزدلی ہی کا راج ہے ۔ بہادری اور جرأت کا ایک شعلہ بھی بھڑک اُٹھے گا ۔

بشن پرشاد : مجھے تو ڈر ہے کہیں پانسہ نہ پلٹ جائے ۔

رحمت علی : بشن پرشاد !

بشن پرشاد : کیا ہے رحمت ؟

رحمت علی : ایسی بات منہ سے مت نکالو ، جنرل اوٹرم آرہے ہیں ۔

بشن پرشاد : مَیں نے تو ویسے ہی کہہ دیا ہے ۔ مگر یار رحمت ! جنرل کی جو حالت آج کل ہم دیکھ رہے ۔ وہ آج تک کسی انگریز کی نہیں ہوئی تھی ۔۔۔۔ خاموش جنرل آگئے ہیں ۔ (ذرا سا وقفہ)

رحمت علی : سلام صاحب !

بشن پرشاد : سلام صاحب !

جنرل اوٹرم : ویل ! تم لوگ کیا کرنا مانگتا ہے ۔

بشن پرشاد : جو حضور حکم دیں ۔

جنرل اوٹرم : ہم پہلے یہ سُننا مانگتا کہ اس وقت کیا ہو رہا ہے ۔

رحمت علی : حضور ! حضرت محل نے جب سے اعلان کیا ہے کہ برجیس قدر اودھ کا بادشاہ ہے اور وہ اُس کی سرپرستی کرے گی عام لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے ۔

جنرل اوٹرم : ہش ! یہ ہم سب کچھ جانتا ہے اور کچھ کہو ۔

بشن پرشاد : حضور ! واجد علی کی باقی تمام بیگمات حضرت محل کی مخالفت کر رہی ہیں ۔

جنرل اوٹرم : اوہ یہ کچھ نہیں ۔ اور کچھ کہو ۔ وہی باتیں بتاتا ہے جو پہلے بتا چکا

ہے۔ کوئی اچھی کھبڑ سناؤ۔

رحمت علی : اچھی خبر کیسی ؟

جنرل اوٹرم : تم نہیں جانتا اچھا کھبڑ کیا ہوتا ہے جو کچھ ہم جانتا ہے وہ مت بتاؤ۔ جو نہیں جانتا وہ بتاؤ۔ اچھا یہ بتاؤ یہ ۔ یہ لیڈی کیا نام ہے اس کا۔

رحمت علی : حضرت محل۔

جنرل اوٹرم : ہاں حضرت محل کون ہے ؟

رحمت علی : حضور آج سے تیرہ برس پہلے یہ ایک معمولی سی لڑکی تھی جسے نواب واجد علی نے اپنے پری خانے میں داخل کر لیا تھا۔ ایک پردہ نشین خاتون ہے۔

جنرل اوٹرم : پڑدہ نشین کیا ؟

رحمت علی : پردہ کرنے والی عورت ___ باہر بہت کم نکلتی ہے۔ علی محمد خاں عرف ممدو خاں اس کا سب سے بڑا مشیر ہے۔

جنرل اوٹرم : ہوں۔ تم نے ہمیں یہ بات نہیں بتائی کہ حضرت محل نے اپنا سارا روپیہ سپاہیوں میں بانٹ دیا ہے۔ اور اعلان کیا ہے کہ ہر سپاہی کو دوگنی تنخواہ ملے گی اور جن سپاہیوں کو ہم تنخواہ دیتا تھا اب وہ انہیں یہ تنخواہ دیا کرے گی۔ کیا یہ بات سچ ہے ؟

بشن پرشاد : سچ ہے حضور !

جنرل اوٹرم : DANGEROUS VERY ہمارا ENEMY نمبر ONE
ڈیکھو ! ہم تم سے کام لینا مانگتا ہے۔ بہت بہت انعام ڈے گا۔

بشن پرشاد : فرمائیے حضور !

جنرل اوٹرم : تم حضرت محل سے ملو۔

رحمت علی : مگر کیسے جناب ؟

جنرل اوٹرم : YOU FOOL بات سنتا ہی نہیں۔ اُس سے کہو ہم جنرل اوٹرم کا ایک خاص پیغام لے کر آیا ہے۔ اس سے کہو۔ جنرل اوٹرم لڑائی کرنا نہیں

مانگتا۔ وہ تمہاری RESPECT یعنی عزت عزت کرتا ہے۔ اس سے کہو کہ ہم جنرل کی طرف سے کچھ شرطیں لے کر آیا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا۔

رحمت علی: جی ہاں۔

جنرل اوٹرم: وہ جب پوچھے کہ شرطیں کیا ہیں، تو کہو لکھنؤ پر تمہاری حکومت ہوگی۔ ہم اس سے کوئی۔ کوئی واسطہ نہ رکھے گا۔ اس شرط پر لڑائی نہیں ہوگی۔ اور یہ بھی کہو کہ جنرل تم کو پچیس ہزار روپیہ MONTHLY دیا کرے گا۔ سُن لیا؟

بشن پرشاد: جی ہاں سُن لیا ہے۔ ہم دونوں آج ہی اُن سے ملیں گے۔

جنرل اوٹرم: ہاں آج ہی ملو۔

بشن پرشاد: اور شام تک ساری کارروائی آپ کو بتا دیں گے۔

جنرل اوٹرم: رحمت علی! تم خاموش کیوں ہے؟

رحمت علی: معاف کیجئے حضور! مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت محل یہ باتیں نہیں مانے گی۔

جنرل اوٹرم: (گرج کر) کیوں نہیں مانے گی؟

رحمت علی: حضور! بات یہ ہے کہ جو باتیں مَیں نے سُنی ہیں اور جو حالات مَیں دیکھ رہا ہوں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت محل کا اصل مقصد اودھ کو آزاد کرانا ہے نہ صرف یہ بلکہ اس کا ارادہ تو یہ بھی ہے کہ دہلی کے بادشاہ کو پھر پہلے کی طرح پورے ہندوستان کا بادشاہ بنا دے۔ چنانچہ اپنے بیٹے کی تخت نشینی پر اُس نے سب سے پہلے بادشاہ ہی کو مبارکباد کا پیغام بھیجا تھا۔

بشن پرشاد: اس سے کیا ہوتا ہے؟

جنرل اوٹرم: اس سے بہت کچھ ہوتا ہے۔ رحمت علی تم ٹھیک بولتا ہے۔ VERY DANGEROUS WOMAN (ذرا خاموش) تم ایک کام کر سکتا ہے۔

رحمت علی: فرمایئے۔

جنرل اوٹرم: پہلے تو حضرت محل کو یہ باتیں بتلاؤ، وہ انکار کر دے تو پھر رحمت علی

اور بشن پرشاد۔

رحمت علی۔ بشن پرشاد : (ایک ساتھ ہی) جی۔

جنرل اوٹرم : شہزادے کو پکڑ کرنے آؤ۔

رحمت علی : جی!

جنرل اوٹرم : ہم تم دونوں کو انعام سے مالامال کر ڈالے گا۔

رحمت علی : بہت مشکل ہے سرکار!

جنرل اوٹرم : NO, NO : NO کوئی مشکل نہیں۔ بشن پرشاد! تم کیا کہتا ہے۔

بشن پرشاد : میرا خیال ہے حضرت محل شرطیں مان لے گی۔

رحمت علی : نہیں مانے گی۔

جنرل اوٹرم : نہیں مانے گی، تو وہ کام کرو جو ہم نے کہا ہے۔

بشن پرشاد : ہو جائے گا۔

جنرل اوٹرم : DYOU BRAVE FELLOW ہم تم پر بہت خوش ہے۔ اسے سمجھاؤ، اسے رحمت علی کو۔

بشن پرشاد : رحمت! یہ بات کوئی مشکل نہیں۔ کسی نہ کسی طرح بیگم سے کام لیا جاسکتا ہے۔

جنرل اوٹرم : YES - YES -

بشن پرشاد : بس ٹھیک ہے حضور! ہم جاتے ہیں۔

(تبدیلیٔ منظر کے لیے موسیقی)

حضرت محل : برجیس بیٹا! پسینے میں شرابور کیوں ہو؟

برجیس قدر : امی! میں شمشیر زنی کی مشق کرتا رہا ہوں۔

حضرت محل : شاباش اب جاؤ پسینہ سکھا کر کچھ دیر آرام کرو۔

برجیس قدر : اچھا امی۔

حضرت محل : کیا ہے انا۔

اَنّا : بیگم حضور! علی محمد خاں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔
حضرت محل : بلاؤ علی محمد خاں کو (ذرا سا وقفہ) علی محمد تمہارے ساتھ دو آدمی کون ہیں؟
علی محمد : جنرل اوٹرم کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ میں نے انہیں دروازے کے باہر بٹھا دیا ہے۔
حضرت محل : پوچھو کیا کہتے ہیں؟
علی محمد : (ذرا بلند آواز سے) بیگم صاحبہ پوچھتی ہیں جنرل اوٹرم نے اُن کے نام کیا پیغام دیا ہے۔
رحمت علی : ملکۂ مکرمہ جنرل اوٹرم نے آپ کی خدمت میں سلام بھیجا ہے، وہ آپ کی اور آپ کی رعایا کی خوشحالی کے آرزومند ہیں۔
حضرت محل : علی محمد! ان سے کہو۔ ہم جنرل صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اب پیغام بتائیں کیا ہے۔
علی محمد : پیغام سناؤ۔
رحمت علی : جنرل صاحب کہتے ہیں کہ کمپنی بہادر بیگم صاحبہ کی بڑی عزت کرتی ہے۔ اس کی دلی آرزو ہے کہ ـــــ
حضرت محل : علی محمد! ان سے کہو جو پیغام لے کر آئے ہیں، وہ سنائیں۔
بشن پرشاد : پیغام یہ ہے حضور کہ ملک پر حکمرانی آپ ہی کی رہے گی۔
حضرت محل : (طنزیہ) یہ حکمرانی شاید بادشاہ دہلی جیسی ہوگی۔
بشن پرشاد : جی۔
رحمت علی : دہلی کا معاملہ دہلی کے بادشاہ کے ساتھ ہے اور آپ کا آپ کے ساتھ۔
بشن پرشاد : جی ہاں بیگم صاحبہ آپ کے ساتھ الگ معاملہ طے کیا جائے گا۔
حضرت محل : سُن لیا ہے۔
رحمت علی : جنرل اوٹرم اس بات کا وعدہ بھی کرتے ہیں کہ آپ کے لیے

٭ پچیس ہزار کی رقم باقاعدہ قیصر باغ میں پہنچتی رہے گی۔

حضرت محل: بس یہی پیغام ہے؟

بشن پرشاد: اصل پیغام یہ ہے کہ جنرل اوٹرم آپ کے خیر خواہ ہیں۔

حضرت محل: خیر خواہ (زہر خند ہنسی) خیر اُن کا ایک بار اور شکریہ۔ جاؤ اپنے آقا سے کہو ہم نے اُن کا پیغام سُن لیا ہے۔ اگرچہ ہمیں اُن کے وعدوں پر کوئی اعتبار نہیں ہے۔ تاہم اُن پر غور کریں گے۔ اور بہت جلد اس کا جواب بھجوا دیں گے۔

رحمت علی: شکریہ ملکہ معظمہ! (ذرا سا وقفہ)

حضرت محل: علی محمد۔ ہمیں اُمید تھی کہ شہزادے کی تخت نشینی کے بعد یہ فرنگی ضرور کوئی نئی چال چلیں گے۔

علی محمد: میں بھی سمجھتا ہوں یہ محض ایک چال ہے

حضرت محل: اُن کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُن کے وعدے پر بھروسہ کر کے فوجی تیاری سے باز آجائیں اور یہ لوگ موقع پا کر کوئی بہانہ ڈھونڈ کے بے خبری میں ہم پر ٹوٹ پڑیں۔

علی محمد: بیگم صاحبہ کا خیال بالکل درست ہے۔

حضرت محل: اگر یہ لوگ شاطرانہ چال چل سکتے ہیں تو ہم کیوں نہ در پردہ فوجی تیاریاں مکمل کرنے کی کوشش کریں؟ انہیں یہ احساس دلانا چاہیے کہ ہم غور کر رہے ہیں اور خفیہ طور پر ایک ایک لمحہ عسکری تنظیم میں صرف کر دینا چاہیے۔ تمہارا مشورہ کیا ہے۔ علی محمد؟

علی محمد: آپ نے جو کچھ سوچا ہے بالکل درست اور وقت کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔

حضرت محل: یہ آہٹ کیسی ہے۔

(ذرا سا وقفہ، فرخندہ محل آتی ہے)

فرخندہ محل: امراؤ خانم!

حضرت محل : شکریہ فرخندہ محل۔ تم نے آج مجھے میرے اصلی نام سے مخاطب کیا۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اودھ کے حکمران کی والدہ ہوں اور حکومت کی سرپرست بھی ہوں۔ میں تم سے اس امر کا تقاضا نہیں کرتی کہ میری عزت کرو۔ لیکن سلطنت اودھ کے سرپرست کا احترام کرنا تو تمہارا فرض ہے۔

فرخندہ : اس بات پر اتنا غرور ہے کہ پاؤں زمین پر ہی نہیں پڑتے۔

حضرت محل : یہ مجھ پر الزام لگا رہی ہو فرخندہ محل۔ بہرحال تم بتاؤ کہنا کیا چاہتی ہو۔

فرخندہ : میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم جو کچھ کر رہی ہو تمام محلات اس کے خلاف ہیں۔

حضرت محل : کیا یہ مخالفت مجھ سے پوشیدہ ہے جو تم خاص طور پر مجھے اطلاع دینے آئی ہو؟

فرخندہ محل : میں تمام محلات کی طرف سے نمائندہ بن کر آئی ہوں۔ ہم سب کا فیصلہ ہے کہ جنرل اوٹرم سے کسی قسم کی پرخاش نہیں رکھیں گے۔

حضرت محل : ذاتی طور پر اُن سے پرخاش تو مجھے بھی نہیں ہے۔

فرخندہ محل : جبھی تمام نوابوں، راجوں، مہاراجوں اور جاگیرداروں کو پوشیدہ طور پر خط لکھے ہیں۔

حضرت محل : فرخندہ محل کیا تم سب اس بات پر رضامند ہو گئی ہو کہ اپنے آرام کی خاطر اپنے وطن کا ننگ و ناموس ایک غیر ملکی قوت کے ہاتھوں فروخت کر دو۔ کیا تم؟

فرخندہ محل : (الفاظ کاٹ کر، زیادہ جوش میں مت آؤ۔ ہمیں خوب علم ہے کہ تم حکومت کا خواب دیکھ رہی ہو۔ مگر یہ خواب ہرگز پورا نہیں ہوگا۔

حضرت محل : مجھے حکمرانی کا کوئی شوق نہیں ہے فرخندہ محل!

فرخندہ محل : اگر شوق نہ ہوتا تو ایسی حرکت ہرگز نہ کرتیں۔

حضرت محل: میں نے کونسی حرکت کی ہے؟

فرخندہ محل: جنرل اوٹرم نے مصالحت کا ہاتھ بڑھایا ہے مگر تم نے اپنے غرور میں اسے پرے ہٹا دیا ہے۔

حضرت محل: فرخندہ محل! اسے پرے ہٹا دیا ہے کیونکہ یہ کسی ہمدرد کا ہاتھ نہیں ہے۔ اُس شخص کا ہاتھ ہے جو ہمارے عزیز وطن کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں ڈال رہا ہے۔ فرنگیوں کی کمپنی تجارت کے لیے یہاں آئی تھی اور اب تاج و تخت پر بھی قبضہ کر رہی ہے۔

فرخندہ محل: اور یہ تاج و تخت تم چاہتی ہو۔

حضرت محل: میرے دل میں تخت و تاج کی کوئی خواہش نہ پہلے تھی نہ اب ہے اور نہ کبھی ہوگی۔ میرے لیے تو صرف یہی دو چیزیں کافی ہیں قرآن مجید اور تلوار۔ انہی کے سہارے میں وطن کی آزادی کی جنگ لڑونگی۔

فرخندہ محل: اسی لیے بالشت بھر کے لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا ہے۔ بڑا گمان ہے بڑا فخر ہے اپنے بیٹے پر۔

حضرت محل: ہر ماں کو اپنے بیٹے پر فخر ہوتا ہے۔

فرخندہ محل: مگر ہر ماں اپنی ہوس کی خاطر بیٹے کو تخت پر نہیں بٹھا دیتی۔

حضرت محل: وطن سے سچی محبت کرنے والی ماں اپنے بیٹے کو تخت پر بھی بٹھا دیتی ہے اور تختۂ دار پر بھی۔ جب موقع آیا تو تم دیکھوگی کہ حضرت محل اپنے لختِ جگر کو وطن کی راہ میں قربان کر دینے پر بھی تیار ہوگی۔

فرخندہ محل: علی محمد۔

علی محمد: جی ارشاد۔

فرخندہ محل: تم تماشائی بن کر کیوں کھڑے ہو۔ اسے سمجھا نہیں سکتے کہ یہ آگ سے کھیل رہی ہے؟

علی محمد : آپ دونوں کی باتوں میں دخل دینے کی جرأت نہیں کر سکتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ بیگم صاحبہ وہ قرض ادا کر رہی ہیں جو اودھ کے تاجدار کو ادا کرنا چاہیے تھا۔

فرخندہ محل : خاموش۔ حضور ملک معظم کی ذات پر بھی حملہ کر رہے ہو۔

علی محمد : یہ ایک حقیقت ہے۔

فرخندہ محل : تم دونوں نے اپنے لالچ کے لیے ایک خطرناک سازش کر رکھی ہے۔

علی محمد : اس سازش میں صرف ہم ہی شریک نہیں ہیں ہزاروں وطن پرست شریک ہیں۔

فرخندہ محل : خیر یہ سازش ہرگز کامیاب نہیں ہوگی۔ تم ہمیں اپنی حرص کی بھٹی کا ایندھن نہیں بناؤ گے۔ (ذرا سا وقفہ) ہم تمہارے ارادے خاک میں ملا دیں گے بہت جلد ملا دیں گے۔ (وقفہ)

حضرت محل : دیکھا تم نے علی محمد! یہ اُن عورتوں کا حال ہے جن کے شوہر کو سنگدلی سے جلا وطن کر دیا گیا ہے اور جن کے وطن کی فضاؤں میں ایک غیر ملکی قوت ایک گدھ کی طرح منڈلا رہی ہے۔

علی محمد : بیگم صاحبہ! میں جانتا تھا کہ محلات آپ کی مخالف ہیں مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ مخالفت اس حد تک پہنچ جائے گی۔

حضرت محل : انہیں صرف اپنی فکر ہے اور کسی کی نہیں۔

علی محمد : اب تو آپ کو دوہری جنگ کرنا پڑے گی۔

حضرت محل : میں ہر جنگ کے لیے تیار ہوں۔ ہر جگہ اور ہر دشمن سے لڑوں گی۔

دلاور : (ہانپتے ہوئے) ملکہ عالیہ (ذرا سا وقفہ) میرا نام دلاور ہے اور کمبل پوش کی پناہ گاہ سے آرہا ہوں۔

حضرت محل : کیا معاملہ ہے۔ کیا پیغام بھیجا ہے انہوں نے؟

دلاور : انہوں نے کہا ہے کہ فرنگیوں نے ہماری گرفتاری کے لیے ہر طرف پہرہ لگا دیا ہے۔

حضرت محل : ہر طرف پہرہ لگا دیا ہے؟

دلاور : حضور! میں نے خود اپنی آنکھوں سے سینکڑوں سپاہیوں کو اُس پہاڑ کے اردگرد گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ جس کے ایک غار میں کمبل پوش اور ان کے ساتھ لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں۔

حضرت محل : علی محمد!

علی محمد : جی بیگم صاحب۔

حضرت محل : اِس وقت یہاں ہمارے جتنے جاں نثار سپاہی موجود ہیں۔ اُن سب کو جمع کر لو۔ ہم کمبل پوش کی امداد کے لیے جائیں گے۔ اسی وقت۔ اسی لمحے۔

علی محمد : آپ تردد نہ کریں۔ میں ابھی سپاہیوں کو ساتھ لے کر جاتا ہوں۔

حضرت محل : نہیں ہم ساتھ جائیں گے۔ فوراً سپاہیوں کو بلاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن اُن بہادروں کو گرفتار کر لیں۔ (وقفہ)

علی محمد : دلاور تم واپس کیوں آ گئے؟

دلاور : سرکار ہمیں راستے ہی میں کمبل پوش کے ایک آدمی نے بتا دیا ہے۔

حضرت محل : کیا بتا دیا ہے؟

دلاور : انہیں اور ان کے اکثر ساتھیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ جس غار میں وہ رہتے تھے وہاں صرف ایک چراغ جل رہا ہے۔

حضرت محل : پھانسی پر لٹکا دیا گیا؟ ہمیں دیر سے اطلاع ملی۔ مگر اُن کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا۔ اُن کا لہو جس چراغ میں جلتا ہے "وہ چراغ کبھی نہیں بجھے گا۔

(منظر کی تبدیلی۔ موسیقی کی لہروں کے عقب میں گھوڑوں کی مدھم ٹاپیں سنائی دے رہی ہیں بگل بج رہا ہے)

حضرت محل: علی محمدؔ!

علی محمد: جی بیگم صاحب۔

حضرت محل: کیا وہ سب نواب، جاگیردار اور راجے حملے کے لیے آچکے ہیں جنھیں خط لکھ کر بلایا گیا ہے؟

علی محمد: جی ہاں، اس وقت محل کے سامنے۔ سید برکات احمد کپتان، صوبہ سنگھ، راجہ مان سنگھ، نواب علی خاں، رئیس محمود خاں، منشی محمد حسین قدوائی، اولاد حسین، حشمت علی، نواب سندیلہ، منصب علی، رسول آباد اور کلو خاں حاکم خانپارہ آچکے ہیں۔ باقی لوگ بھی بڑی تیزی سے آ رہے ہیں۔

حضرت محل: ہم اپنے سپاہیوں سے خود خطاب کریں گے۔

علی محمد: بسم اللہ۔

(ہنگامے تاہیں ابھر آتی ہیں۔ قریب بگل بج رہا ہے ناقوس پھونکا جا رہا ہے)

علی محمد: (بلند آواز سے) خاموش۔ ملکۂ عالیہ خطاب کرنا چاہتی ہیں۔

(عارضی طور پر خاموشی چھا جاتی ہے)

حضرت محل: وطن کے پیارے سپاہیو اور میرے فرزندو! اب تک جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ ایک غیر ملکی قوت نے صیاد بن کر ہمارے ملک کے شاداب باغ کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ پھول نوچ لیے ہیں۔ کلیاں پامال کر دی ہیں اور ہرے بھرے درختوں کی شاخیں کاٹ دی ہیں۔ ہندوستان کا شہنشاہ آج دہلی کے لال قلعے میں ایک بے دست و پا قیدی کی سی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اودھ کا نواب کلکتے کے مٹیا برج میں ایام اسیری گزار رہا ہے۔ بہادرو! عہد کرو کہ فرنگیوں کو نکال دیا جائے گا۔ بیلی گارڈ کو اپنے حملے سے زمین کے برابر کر دیا جائیگا اور آزادیٔ وطن کے پرچم کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا جائے گا۔ ہم جیتیں گے تو آزاد ہو کر جئیں گے ورنہ شمع آزادی پر پروانوں کی طرح قربان ہو جائیں گے۔ بہادرو! کمبل پوش اور اس کے ساتھی تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ تمہارے بزرگوں کی آنکھیں

تم پر بھی ہیں۔ آؤ وطن کے دشمنوں کو گھوڑوں کے پاؤں تلے کچل ڈالیں۔ آزادی یا موت۔ موت یا آزادی۔

(بہت سے لوگوں کا شور بلند ہوتا ہے آزادی یا موت۔ اور اس کے ساتھ ہی پہلے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں گی اور اس کے بعد جنگ کا ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ کئی لمحے یہ ہنگامہ برپا رہے گا۔ یہ ہنگامہ بتدریج ختم ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ خاموشی چھا جائے گی)

حضرت محل: (گھبراتی ہوئی آواز میں) علی محمد مجھے بتاؤ وہ دُور شعلیں کیسی جل رہی ہیں۔

علی محمد: ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ آرہے ہیں۔

حضرت محل: ہماری فوج میں؟

علی محمد: جی ہاں۔

حضرت محل: (آواز میں حیرت) بہت اچھا۔ میں دیکھ رہی ہوں۔

علی محمد: بیگم صاحب۔ جس جوش سے آج ہمارے سپاہی لڑے ہیں، اگر چند روز اور اسی جوش سے لڑتے رہیں تو فرنگیوں کو ذلت آمیز شکست ہو جائے گی اور وہ بیلی گارڈ کیا اس ملک ہی کو چھوڑ دیں گے۔

حضرت محل: یہ ہونا ہی چاہیے — یہ ہو کر رہے گا۔ علی محمد اس وقت ہم کھڑکی میں کھڑے تاریکیوں کی اُس فصیل کے پیچھے دیکھ رہے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ کے اندر ایک چراغ جل رہا ہے جسے وطن کے ایک جاں باز سپاہی نے روشن کیا تھا، یہ چراغ اب بھی جل رہا ہے۔

علی محمد: یہ چراغ تو کبھی نہیں بجھے گا۔

حضرت محل: انشاء اللہ تعالیٰ۔

علی محمد: بیگم صاحب، میں ایک خاص مقصد کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

حضرت محل: کہو۔ بے تکلف کہو۔

علی محمد: سپاہیوں میں شہزادہ برجیس قدر کے غائب ہونے کی بات پھیلائی جارہی ہے۔

حضرت محل: پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

(حضرت محل کی آواز ڈوبنے لگتی ہے پھر یکایک سنبھل جاتی ہے)

علی محمد: میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سپاہیوں سے خطاب کریں تاکہ شہزادے کی گمشدگی سے جو گھبراہٹ پھیلی ہوئی ہے وہ دُور ہو۔

حضرت محل: علی محمد! میں اپنے سپاہیوں کے خیموں میں جاؤں گی۔ آؤ علی محمد میرے ساتھ چلو۔

(تبدیلیِ منظر کے لیے موسیقی جو بتدریج مدھم ہو کر لوگوں کے شور میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ شور بڑھتا جائے گا)

حضرت محل: اب سپاہی کہتے کیا ہیں۔

علی محمد: کہتے ہیں ہمیں بادشاہ دکھاؤ! بادشاہ کہاں ہے۔

حضرت محل: اس سوال کا جواب میں دوں گی۔

(شور ایکدم بڑھ جاتا ہے)

حضرت محل: بہادر سپاہیو اور رہنما بازو سنو۔

(شور مدھم ہونے لگتا ہے)

جیسا کہ تم جانتے ہو میں بادشاہ کی ماں بھی ہوں اور سرپرست بھی۔ تمہارے سوال کا جواب مجھ سے بہتر اور کوئی نہیں دے سکتا اور میں اس سوال کا جواب دینے آئی ہوں۔ تمہیں بتایا گیا ہے کہ بادشاہ محل میں نہیں ہے میں تم سے یہ نہیں کہتی کہ اس بات پر یقین کرو۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم اودھ کے بادشاہ کے لیے لڑ رہے تھے یا وطن کی آزادی کے لیے۔ اگر تم وطن کی آزادی کے لیے لڑے ہو تو میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ اودھ کے بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ بھی

تمہاری طرح ایک سپاہی ہے۔ ملک کی آزادی کی خاطر ایک بیگم نہیں سینکڑوں، ہزاروں بیگمیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ بتاؤ کس کے لیے لڑ رہے ہو؟

(مجمعے میں سے آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ آزادی کے لیے۔ آزادی کے لیے)

حضرت محل: آزادی کے لیے لڑ رہے ہو تو لڑائی ختم نہیں ہوئی لڑائی جاری ہے۔ اور جب تک وطن آزاد نہیں ہوگا۔ لڑائی جاری رہے گی۔ بہادرو! وطن تمہیں بلا رہا ہے۔ وطن ایک پابہ زنجیر قیدی کی طرح تمہاری راہ تک رہا ہے۔

(جنگ کا ہنگامہ جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ختم ہوکر موسیقی باقی رہتی ہے جو بتدریج مدھم ہوتی رہے گی)

علی محمد: آج جس طوفانی جوش سے ہماری فوجوں نے بیلی گارڈ پر حملہ کیا ہے اُس نے ثابت کر دیا ہے کہ انگریز اس ملک سے نکل جانے پر مجبور ہو جائیں گے اور چند روز تک اُن کا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔ پہلے حملے میں ہی انگریزوں کی سب سے بڑی خندق اُڑ گئی۔ ہمارے سپاہی سیڑھیاں لے کر آگے بڑھے اور دیواروں پر چڑھ گئے۔

حضرت محل: یہ منظر میرے سامنے پھر رہا ہے۔ علی محمد میں ایک مضمون لکھواتی ہوں۔ اس کے ہزاروں اشتہار بنا کر بازاروں اور گلیوں اور دیواروں پر چسپاں کر دو۔

علی محمد: لکھوائیے۔

حضرت محل: لکھو ”سب خاص و عام بگوشِ ہوش سن لیں کہ ان کافر فرنگیوں نے جب شہنشاہ دہلی کو جلاوطن کر کے دہلی پر قبضہ کر لیا تو ایسا ظلم ڈھایا کہ اُس کی مثال نہیں مل سکتی۔ انہوں نے نہ بوڑھوں کو چھوڑا اور نہ بچوں کو۔ ہر ایک کو تہِ تیغ کر دیا۔ گولیوں سے اُڑا دیا۔ پھانسی پر لٹکا دیا اور اگر خدانخواستہ ان ظالموں نے لکھنؤ بھی فتح کر لیا تو یہی حال یہاں بھی ہوگا۔ تمہارے بچے تمہاری آنکھوں کے سامنے مارے جائیں گے۔ اس لیے موقع ہے (اب اس کی آواز میں زیادہ جوش پیدا ہو جاتا ہے) کہ سب مل کر انہیں یہاں سے نکال دو۔ انہیں اس ملک میں رہنے نہ دو۔

انہیں عبرت ناک شکست دو۔ (علی محمد سے مخاطب ہو کر) اور اس کے نیچے لکھو۔ تم سب کی ماں۔

علی محمد: ماں۔

حضرت محل: ہاں ماں۔ حضرت محل۔

(منظر بدلتا ہے)

جنرل اوٹرم: یہ کیا تماشا تم لوگوں نے بنا رکھا ہے۔ آٹھ مہینے سے لڑائی ہو رہی ہے اور بیگم ابھی تک لڑ رہا ہے۔

رحمت علی: جنرل صاحب! ہمارا کام آپ کو خبریں پہنچانا ہے۔ لڑنا ہمارا کام نہیں ہے۔

جنرل اوٹرم: اور کیا کیا ہے تم نے۔ بیگم کا بیٹا پکڑ کر لائے اور اسے راستے ہی میں چھوڑ دیا۔

بشن پرشاد: حضور! اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ اس نے اپنے خنجر سے مجھے زخمی کر دیا۔

جنرل اوٹرم: اسے جانے کیوں دیا تھا۔ پکڑ کر لے آتے پھر ہم بیگم سے کہتے۔ لڑائی بند کرو نہیں تو ہم تمہارا بیٹا مار ڈالے گا۔ اب کیا کہیں اتنا روپیہ لیتے ہو اور کام کچھ نہیں کرتے۔

رحمت علی: ہم تو سب کچھ کر رہے ہیں حضور!

جنرل اوٹرم: اب فوج کتنا ہے بیگم کے پاس۔

رحمت علی: اسّی ہزار۔

جنرل اوٹرم: EIGHTY THOUSAND! ڈیم۔ یہ سب لوگ لڑ رہا ہے۔

بشن پرشاد: جی ہاں۔

جنرل اوٹرم: اور کون کون آ گیا ہے اس کے ساتھ۔

بشن پرشاد: تانتیا ٹوپی۔

جنرل اوٹرم: ٹائیٹ ٹوپی بھی۔

بشن پرشاد: جی ہاں اور جنرل بخت۔

جنرل اوٹرم: جنرل بکٹ کاں YOU WRETCHED

رحمت علی: ہم کیا کر سکتے ہیں حضور۔

جنرل اوٹرم: ہم کمپنی کو کیا منہ دکھائے گا۔ VERY SHAMEFUL

بشن پرشاد: جنرل صاحب۔

جنرل اوٹرم: کیا ہوتا ہے۔

بشن پرشاد: مہاراجہ بال کرشن آئے ہوئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

جنرل اوٹرم: بلاؤ ہم ان کا راستہ دیکھ رہا تھا۔

(ذرا سا وقفہ)

بال کرشن: حضور جنرل صاحب! GOOD AFTERNOON

جنرل اوٹرم: WELCOME-WELCOME سلام سلام۔ رحمٹ اور ٹم کرشن پرشاد! ہم تم کو پھر یاد کرے گا۔ اچھا (ذرا سا وقفہ) ویل مہاراج! ہم اُمید کرتا ہے کہ تم ہماری مدد کرے گا اور ہم اس مڈڈ کا بڑا اچھا بہت بڑا REWARD وہ کیا کہتے ہیں۔ انعام۔ انعام ڈے گا۔ سمجھ لیا۔

بال کرشن: جنرل صاحب۔ میں ایک سکیم لے کر آیا ہوں۔ لڑائی سے آپ حضرت محل کو شکست نہیں دے سکتے۔

جنرل اوٹرم: کیسے شکسٹ ڈے سکتا ہے؟

بال کرشن: ہم جانتے ہیں کہ اسے کس طرح شکست ہو سکتی ہے ہماری سکیم کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔

جنرل اوٹرم: یہ سچ؟ کیا ایسا ہوگا؟

بال کرشن: ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ چند دن کے اندر اندر آپ دیکھئے ہوتا کیا ہے۔

جنرل اوٹرم: جتنا روپیہ مانگو گے ہم ڈے گا۔ زیادہ دے گا GO AHEAD PLEASE

(موسیقی کے ساتھ منظر بدلتا ہے)

بال کرشن : تسلیمات بیگم صاحب۔

حضرت محل : آؤ بال کرشن۔ کیا خبریں ہیں۔

بال کرشن : بیگم صاحب! میں اپنی طرف سے اور تمام ملک کی طرف سے آپ کی خدمت میں خلوصِ دل کے ساتھ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ کی رہنمائی میں ہمارے ویر سپاہی جس بہادری سے لڑ رہے ہیں۔ اس سے فرنگیوں کی کمرِ ہمت ٹوٹ گئی ہے اور وہ یہاں سے چلے جانے کے لیے رختِ سفر باندھ رہے ہیں۔

حضرت محل : یہ مبارکباد صرف میرے لیے نہیں سب مجاہدوں کے لیے ہے۔ اُنہی کے ہمت و استقلال سے ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

بال کرشن : صرف چند روز کی بات ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس ملک سے ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی۔

حضرت محل : اُسے جانا چاہیے ہم سب اُس مبارک دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔

بال کرشن : بیگم صاحب۔

حضرت محل : کہو بال کرشن۔

بال کرشن : اور تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہماری فوجیں بیلی گارڈ کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تُلی ہوئی ہیں۔ مگر ——

حضرت محل : مگر کیا!

بال کرشن : میں ایک معاملے میں بہت فکر مند ہوں۔

حضرت محل : کیا ہے۔ ہمیں تمہاری ذات پر مکمل اعتماد ہے۔ جو کچھ کہو گے بالکل صحیح کہو گے۔

بال کرشن : بیگم صاحب: میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں وہ فقط میں ہی نہیں ہماری فوج کے سب افسر بری طرح محسوس کر رہے ہیں۔ آزادی کی جنگ میں ملک

کے کونے کونے سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ ریاستوں اور صوبوں کے نواب جاگیردار اور راجے مہاراجے بھی ہیں۔ اب تک تو ان کو کوئی دقت پیش نہیں ہوئی۔ لیکن اب دقت یہ ہوئی ہے کہ نواب، جاگیردار سارا کا سارا روپیہ خرچ کر چکے ہیں۔ ان کے پاس مزید اخراجات کے لیے کچھ بچا نہیں۔

حضرت محل : ہاں یہ تکلیف دہ صورت ضرور ہے۔

بال کرشن : مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ حضور بھی سب کچھ فوجوں کو دے چکی ہیں۔

حضرت محل : ہمارا خزانہ خالی ہو چکا ہے۔

بال کرشن : آپ کو معلوم ہے کہ لڑنے والی فوجوں کے لیے صرف بہادری ہی نہیں روپے کی بھی شدید ضرورت رہتی ہے۔

حضرت محل : رہتی ہے۔

بال کرشن : اگر سپاہیوں کو تنخواہ دی نہیں جائے گی تو وہ لڑائی جاری کیونکر رکھیں گے ؟

حضرت محل : ہمارے سپاہیوں نے ایسا مطالبہ تو نہیں کیا۔

بال کرشن : مطالبہ آپ کی ذات تک نہیں پہنچا۔

(ذرا سا وقفہ)

حضرت محل : ورنہ۔

بال کرشن : سب جاننے والے یہ معاملہ جانتے ہیں مگر بیگم صاحب! یہ مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

حضرت محل : کس طرح !

بال کرشن : بال کرشن! یہ لوگ یعنی جاگیردار وغیرہ اگر اپنے اپنے علاقوں میں جائیں تو مطلوبہ روپیہ فوراً لا سکتے ہیں۔ ان کے آتے ہی جنگ دس گنا زیادہ جوش و خروش سے جاری ہو جائے گی۔ اور وہ کام جو دس برس میں ہو سکتا ہے، صرف

ایک دو روز میں ہو جائے گا۔

حضرت محل: (سوچ کر) ایک۔ دو روز میں ہو جائے گا۔ اور کیا چاہیے۔ ہم اعلان کر دیں گے کہ ریاستوں کے حکمرانوں کو روپیہ لانے کے لیے اپنے اپنے علاقوں میں جانے کی اجازت ہے۔

بال کرشن: یہ اعلان جاری کروا دیں تاکہ ہماری فوجوں کے حوصلے بدستور بلند رہیں۔

(موسیقی چند لمحے جاری رہ کر توپوں کی گھن گرج میں جذب ہو جاتی ہے۔ یہ گھن گرج بڑھتی جا رہی ہے)

حضرت محل: علی محمد! یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہماری فوجیں انہیں خاموش نہیں کر سکتیں؟

علی محمد: ان توپوں کو خاموش کرنے والے خود ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے ہیں۔

حضرت محل: یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

علی محمد: بیگم صاحب۔ میں نے اس دن آپ سے کہہ دیا تھا کہ آپ نے ریاستوں کے حکمرانوں کو واپس بھیج کر سخت غلطی کی ہے۔ ان کے جانے کے بعد لڑانے والے نہ رہے، صرف لڑنے والے باقی رہ گئے۔ فرنگی چال چل گئے۔ آپ کو اس شخص نے دھوکا دیا جس پر آپ کو بڑا اعتماد تھا۔

حضرت محل: بال کرشن نے؟

علی محمد: اس ملک میں آستین کے سانپوں کی کمی کبھی نہیں رہی۔ یہ بال کرشن بھی وہ سانپ تھا جو اس لیے دودھ پر پلتا رہا کہ ایک دن چپ چاپ اپنے آقاؤں ہی کی رگوں میں سارا زہر اُتار دے۔ دشمن کے ہزاروں سپاہی بھی وہ کام نہیں کر سکتے جو صرف ایک غدار کر سکتا ہے۔

حضرت محل: میں دھوکے میں آ گئی۔ فرنگی جنگ کے میدان میں مجھے شکست

نہ دے سکے۔

علی محمد: اس لیے تو انہوں نے سازش کا جال پھیلا دیا۔

حضرت محل: سازش کے اس جال کو میں پارہ پارہ کر دوں گی۔ میں سپاہیوں کو جمع کر کے سخت حملہ کروں گی۔

علی محمد: بیگم صاحبہ!

حضرت محل: علی محمد! مجھے مت روکو۔ مت روکو۔ علی محمد! بادشاہ کی نگرانی تم کرنا۔ میں شاید واپس نہ آ سکوں۔

علی محمد: بیگم! جب ماں ایک خطرناک غلطی پر غلطی کر رہی ہے تو اس کے بیٹے کی کون نگرانی کریگا۔ اس ملک کی کون حفاظت کرے گا؟

حضرت محل: علی محمد! (آواز میں گہرا دکھ) علی محمد!

(توپوں کی گھن گرج قریب آتی جاتی ہے)

علی محمد: بیگم صاحبہ واپس چلئے۔ جلدی کیجئے۔ آپ کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو آزادی ایک خواب بن جائے گی۔

(وقفہ۔ جس کے دوران میں غمناک موسیقی ابھرنے لگتی ہے۔ عقب میں جنگ کا شور)

حضرت محل: محل کی دیواریں کس طرح کانپ رہی ہیں۔ اندھیرا کس طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سورج کہاں گم ہو گیا۔ چاند کو کس بادل نے نگل لیا۔ ستارے کہاں چھپ گئے۔ کتنا بھیانک اندھیرا۔ وہ میرا خواب۔ میرا آزادی کا خواب۔ پامال ہو رہا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اور میں۔ میں۔

علی محمد: بیگم صاحب۔ وقت بہت کم ہے۔ فرنگی بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

حضرت محل: ٹھہرو علی محمد! مجھے اس محل کی چوکھٹ پر آخری بار آنسو بہا لینے دو۔ پتہ نہیں اب کبھی یہاں قدم رکھنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ ان دیواروں کو

دیکھ لینے دو۔ جن میں میری زندگی کی ہزاروں خوشیاں دفن ہو گئی ہیں۔ اور یہ محل کے باہر پھیلا ہوا میرا لکھنؤ۔ میرا پیارا لکھنؤ۔ میری مسرتوں کا دیار۔ میرے خوابوں کی سرزمین لکھنؤ! رخصت! میرے وطن رخصت!

علی محمد: چلیے بیگم۔

حضرت محل: چلو۔ اودھ کا تاجدار جب اپنا وطن چھوڑ رہا تھا۔ تو اس نے کہا تھا۔

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اور آج میں بھی۔ علی محمد! میری آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔ تاکہ مجھے کچھ نظر نہ آئے۔ میرے لکھنؤ کے بازار، میرے لکھنؤ کی سڑکیں۔ کچھ نظر نہ آئے۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔

(حضرت محل کی دبی دبی سسکیاں، غمناک موسیقی مسلسل جاری رہتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد موسیقی ایسی موسیقی میں تبدیل ہو جاتی ہے جس سے محسوس ہو کہ قافلہ چلا جاتا ہے)

حضرت محل: کتنے دن۔ کتنی راتیں گزر گئیں۔ اب ہم کہاں آگئے ہیں۔ یہ کونسی پہاڑیاں ہیں؟

علی محمد: ہم نیپال میں آپہنچے ہیں۔ یہ نیپال کی پہاڑیاں ہیں۔

حضرت محل: بس اب ہم آگے نہیں جائیں گے۔ تھک کر چُور ہو چکے ہیں۔ قسمت ہمیں کہاں لے آئی۔ ہمارا وطن کتنا پیچھے رہ گیا۔ ہم کتنی دُور نکل آئے۔ یہاں چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ اس وقت لکھنؤ کے آسمان پر بھی چاند چمک رہا ہوگا۔ چاروں طرف چاندنی پھیلی ہوگی۔ میرا محبوب وطن چاندنی میں ڈوبا ہوگا۔ مگر یہ چاندنی کہاں ہے۔ یہ تو غلامی کا کفن ہے۔ لیکن مایوس نہ ہو وطن! تیرے ایک غار میں ایک چھوٹا سا دیا روشن ہے۔ یہ دیا ہمیشہ روشن رہے گا اور پھر

ایک دن اس کی روشنی غار کی تاریک دیواروں سے نکل کر چھا جائے گی۔ یہ روشنی، آزادی کی روشنی ہوگی۔

O

سلطان محمود غزنوی

کردار:

امیر سبکتگین ۔۔۔۔۔

محمود ۔۔۔۔۔ بعد میں سلطان محمود غزنوی۔ امیر کا سب سے بڑا بیٹا

ابوالحسن ۔۔۔۔۔ امیر اور سلطان کا معتمد

اسماعیل ۔۔۔۔۔ امیر کا بیٹا۔ سلطان کا سوتیلا بھائی

بانو ۔۔۔۔۔ محمود کی والدہ

غیاث ۔۔۔۔۔ سلطان کا خاص خادم

ایاز ۔۔۔۔۔ سلطان کا معتمد

پریتما ۔۔۔۔۔ سومنات کی ایک داسی

بھاگوت ۔۔۔۔۔ ایک کسان۔ پریتما کا باپ

چمن ۔۔۔۔۔ سومنات کا ایک پجاری

مہامہنت ۔۔۔۔۔ سومنات کا سب سے بڑا پجاری

مہنت ۔۔۔۔۔ ایک پجاری

ان کے علاوہ سومنات کے متعدد پجاری

اور موذن

O

(افتتاحی موسیقی جو بتدریج مدھم ہو کر سناٹا چھا جاتا ہے۔ ایسے میں غزنی کے
محل کے کمرۂ خاص سے باہر امیر سبکتگین کی آواز اُبھرتی ہے)

امیر سبکتگین : کون ہے؟

بانو : مَیں ہوں یا امیر!

سبکتگین : بانو! آجاؤ۔

بانو : آپ رات کے وقت خوابگاہ سے باہر کیسی پریشانی ہے آپ کو؟

سبکتگین : کوئی پریشانی نہیں۔ ہمیں کسی قسم کی پریشانی نہیں۔

بانو : کوئی پریشانی نہیں اور۔

سبکتگین : (جلدی سے) بانو! اگر سبکتگین اپنی پریشانیوں کا خیال کرتا تو آج غزنی کا حکمران نہ ہوتا۔ ہماری ساری زندگی مصیبتوں میں گزری ہے۔ مگر زندگی کے حوادث نے ہمیں کبھی پریشان نہیں کیا، ہم نے مصیبتوں کا مقابلہ کرنا سیکھا ہے۔ ان سے شکست کھانا نہیں۔

بانو : آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر مَیں شک کرنے والی کون؟ لیکن یہ آدھی رات کو۔

سبکتگین : (جلدی سے) بانو! آج ہمیں اپنا پرانا زمانہ یاد آ گیا تھا۔

بانو : گزرے ہوئے لمحات کسے یاد نہیں آتے؟

سبکتگین : (بانو کی بات ان سنی کر کے) وہ زمانہ جب مصیبتوں کی ابتدا ہوئی تھی۔ اُس وقت ہماری عمر تیرہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ واقعہ ترکستان کا ہے۔ ایک رات سب سو رہے تھے کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

بانو : یہ انہی دنوں کی بات ہے نا جب آپ کو ایک راہزن گرفتار کر کے لے گیا تھا اور آپ چار سال تک قید خانے میں بند رہے تھے؟

سبکتگین : ہاں ۔ ہماری مصیبتوں کی ابتدا یہیں سے ہوئی تھی۔

بانو : یا امیر! اجازت ہو تو کچھ پوچھوں؟

سبکتگین : کہو! ہم تمہاری ہر بات سنیں گے۔

بانو : آج آپ کا اپنا بیٹا اسیرِ زنداں ہے۔ جرأت کر کے پوچھتی ہوں کہ اس وقت آپ کیا سوچتے ہیں؟

سبکتگین : ہم یہ زمانہ بھی کیسے بھول سکتے ہیں؟

بانو : معاف کیجیے! آپ بھول چکے ہیں۔ بیٹا قید خانے میں ہو اور باپ کہے مجھے کوئی پریشانی نہیں۔

سبکتگین : بانو! ہم باپ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حکمران بھی ہیں اور تم ـــــ صرف ماں ہو ـــــ صرف ایک ماں۔

بانو : تو کیا حکمران ہونے کے بعد باپ کا دل بیٹے کی محبت سے خالی ہو جاتا ہے؟

سبکتگین : خالی نہیں ہوتا۔ مگر وہ ماں کی طرح جذباتی نہیں رہتا۔ تاہم ہم سمجھتے ہیں تم بھی مجبور ہو۔ تم صرف ان سلاخوں کو دیکھتی ہو جو تمہارے بیٹے کے ارد گرد کھڑی ہیں۔ اور ہم اُن زہریلے ارادوں کو بھانپتے ہیں جو ہمارے بیٹے کے دل میں پرورش پا رہے ہیں۔

بانو : میرا محمود ایسا نہیں ہے۔

سبکتگین : بانو! یہ حکومت کی حرص بڑی ظالم چیز ہے جو نیک سے نیک انسان کو بھی راہِ راست سے ہٹا دیتی ہے۔

بانو : اسے گستاخی نہ سمجھئے مگر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ فقط آپ کا ـــــ وہم ہے۔

سبکتگین : جو شخص زندگی کی کڑی سے کڑی آزمائشوں سے گزر چکا ہو وہ واہموں کا شکار نہیں ہوسکتا۔

بانو : میں اپنے بیٹے کو خوب جانتی ہوں۔

سبکتگین : اور ہم بھی اسے خوب سمجھتے ہیں۔

بانو : آپ سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہوگا کہ جو حکمران کے سامنے تلوار اُٹھانے کی ہمت نہیں کرسکتے وہ سازش کرکے حکمران کو اس کے اپنے خون سے بھی بدظن کردیتے ہیں۔ محمود آپ کا بیٹا ہے۔ آپ کی اطاعت وہ اپنا فریضۂ حیات تصوّر کرتا ہے ـــ مگر یہ سازشی لوگ ـــ

سبکتگین : کیا یہ حقیقت فقط تم جانتی ہو؟

بانو : آپ نہیں جانتے!

سبکتگین : بانو! ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حکمرانی کی خواہش انسان کو اندھا بنادیتی ہے۔ تاریخ کئی ایسے بیٹوں کی مثال پیش کرتی ہے جن میں سے ہر ایک نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی اور یوں تخت و تاج پر قبضہ کرلیا۔

بانو : اور کیا تاریخ کی زبان ایسے معاملات میں گنگ ہے جب وزیروں اور امیروں نے کئی حکمرانوں سے اُن کا جائز حق چھین لیا۔ باپ کو بیٹے سے بدظن کردیا اور پھر اقتدار کی جنگ میں دونوں کو راستے سے ہٹادیا؟

سبکتگین : یقیناً ایسا ہوا ہے۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے!

بانو : تو اس معاملے میں مجرم کون ہے؟

سبکتگین : وہی جو اپنے جُرم کی سزا بُھگت رہا ہے۔

بانو : اور وہ نہیں جنہوں نے باپ کو بیٹے سے اور بیٹے کو باپ سے بدظن کردیا ہے؟

سبکتگین : ثبوت؟

بانو : آنے والا وقت دے گا۔

سبکتگین : تو ہم آنے والے وقت کا انتظار کرتے ہیں۔

بانو : اور اس وقت تک میرا بیٹا قلعہ غزنی کے قید خانے ہی میں رہے گا۔

سبکتگین : ہاں۔

بانو : ایسا نہیں ہونا چاہیئے!

سبکتگین : (درشتی سے) کیا ہونا چاہیئے اور کیا نہیں ہونا چاہیئے اس کا فیصلہ ہم کرسکتے ہیں کوئی اور نہیں۔

بانو : آپ کو فیصلہ کرنے سے کون روک سکتا ہے؟

سبکتگین : تم!

بانو : مَیں!

سبکتگین : تو اور کون؟

بانو : کیا ایک حکمران کی رفیقۂ حیات کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے دُکھ سُکھ میں شریک ہو، اس کی پریشانیوں میں ساتھ دے؟

سبکتگین : دُکھ سُکھ میں شریک ہونے یا پریشانیوں میں ساتھ دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ مجرم بیٹے کو بے گناہ بھی ثابت کرے۔

(ذرا سا وقفہ)

بانو : معافی چاہتی ہوں۔

سبکتگین : تم جاسکتی ہو۔

بانو : بہتر یا امیر۔

(وقفہ جو ذرا طویل ہے)

سبکتگین : (بلند آواز میں) بانو!

بانو : (ذرا زور سے) ارشاد۔

سبکتگین : واپس آؤ۔

بانو : فرمایئے!

سبکتگین : کیا تم سمجھتی ہو کہ ہمیں تمہارے جذبات کا احساس نہیں ہے۔ کیا ہمیں معلوم نہیں ہے کہ تمہارے دل میں کیا کشمکش برپا ہے اور تم کس دکھ میں مبتلا ہو؟

بانو : جس دکھ میں میں مبتلا ہوں وہ صرف میرا دکھ ہے صرف ایک ماں کا دکھ ہے۔

سبکتگین : یہ مت بھولو کہ یہ دکھ باپ کے دل میں بھی ہے۔

بانو : سچ کہتے ہیں آپ؟

سبکتگین : اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم ابھی وقت وہاں جائیں گے جہاں ہمارا مجرم بیٹا زنداں میں اسیر ہے۔ ہم دونوں اُسے آزماتے ہیں۔

(گزرانِ وقت کے لیے موسیقی۔ سبکتگین اور بانو قید خانے میں محمود کے پاس)

بانو : محمود بیٹا!

محمود : امی جان آپ!

سبکتگین : تم نے ہمیں نہیں دیکھا بیٹے!

محمود : بابا جان! آپ نے زحمت فرمائی۔ احسان مند ہوں۔

بانو : محمود بیٹا! تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ تمہیں یہاں دیکھ کر ہمیں کتنا دکھ ہوا ہے۔

محمود : امی! آپ دکھی کیوں ہوتی ہیں۔ میرے والد بزرگوار نے بھی تو چار سال کی مدت قید خانے میں گزاری تھی۔

سبکتگین : باپ سے غداری کر کے تمہاری طرح؟

محمود : ہرگز نہیں۔ میں غدار کبھی نہیں تھا اور نہ آج ہوں۔

سبکتگین : ہر مجرم اپنے جرم کو چھپانے کے لیے اسی قسم کی باتیں کرتا ہے۔

بانو : میں تو بار بار کہہ رہی ہوں کہ میرا محمود ایسی شرمناک حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔ اس نے میرا دودھ پیا ہے اور اس دودھ میں زابلستان

کے باغوں کی خوشبو اور وہاں کے پہاڑوں کی سنگینی شامل ہے۔ یہ خوشبو اور سنگینی وفاداری، جرأت اور بہادری کی ہے۔ جس سرزمین نے لازوال رستم کو پیدا کیا تھا اسی خاک سے میرا خمیر بھی اٹھا ہے۔ میرا بیٹا کبھی غداری نہیں کرسکتا اور پھر اپنے باپ کے خلاف؟ ایسا ممکن نہیں۔

سبکتگین: بانو ہم تمہارے خیالات کی قدر کرتے ہیں مگر حقیقت کو ایسی باتوں سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

محمود: بابا جان! مجھ سے پوچھیے۔

بانو: مجھے اس کا یقین ہے کہ غدار فائق اور ابو علی سجوری نے تمہارے باپ کو تمہارے خلاف بھڑکایا ہے۔

سبکتگین: تم غزنی کے تخت پر قبضہ کرنا نہیں چاہتے تھے؟

محمود: میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔

سبکتگین: اور جو کچھ تمہارے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کیا وہ غلط ہے؟

محمود: غلط ہے۔

بانو: شکر ہے اللہ پاک تیرا بیٹے کی طرف سے باپ کا دل صاف ہو گیا۔

سبکتگین: بانو! جلد بازی مت کرو۔ ہم نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ آج رات ہم اپنے بیٹے کو آزمائیں گے۔

بانو: جی ہاں۔

سبکتگین: اور ہم نے ابھی اس کی آزمائش نہیں کی۔

محمود: بابا جان میں ہر آزمائش کے لیے حاضر ہوں۔

سبکتگین: تم کہتے ہو کہ تم نے ہمارے خلاف کسی قسم کی سازش نہیں کی۔

بانو: کہہ تو رہا ہے اور کس طرح کہے؟

سبکتگین: تم خاموش رہو۔ ہم براہ راست اس سے مخاطب ہیں۔

محمود: فرمائیے۔

سبکتگین : یہ لو ہماری تلوار اور اس کی قسم کھا کر کہو کہ اس سے امیر سبکتگین کے دشمنوں کا مقابلہ کرو گے اور انہیں ہر میدان میں شکست دو گے۔ پکڑو اسے۔

محمود : نہیں۔

بانو : (مضطربانہ انداز میں) یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹے!

سبکتگین : بانو! سن لیا ہے تم نے۔ دیکھ لیا ہے کہ تمہارا بیٹا قسم کھانے سے انکار کرتا ہے۔

بانو : محمود!

محمود : میں نے قسم کھانے سے انکار نہیں کیا۔

سبکتگین : پھر یہ تلوار کیوں نہیں پکڑتے؟

محمود : میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔

سبکتگین : اس کا مطلب کیا ہے؟

محمود : آپ سمجھ سکتے ہیں۔

سبکتگین : چلو بانو۔

بانو : محمود۔ میرے بیٹے! سنو!

سبکتگین : بانو! نکلو یہاں سے تم نے سنا نہیں ہے (گرج کر) نکلو یہاں سے!

بانو : ذرا ٹھہر جائیے۔

سبکتگین : (بڑے غصّے سے) بانو!

(ذرا سا وقفہ)

تم نے اپنے بیٹے کا رویہ دیکھ لیا ہے۔

بانو : میں کچھ سمجھ نہیں سکی۔

سبکتگین : تم کچھ نہیں سمجھ سکو گی۔ ہم جانتے تھے کہ یہ آزمائش میں پورا نہیں اترے گا پھر بھی ہم خوش ہیں۔

بانو : خوش ہیں بیٹے کو نظروں سے گرا کر؟

سبکتگین : وہ ہماری نظروں سے نہیں گرا۔ اُس نے دل کی بات چھپائی نہیں ہے۔ صاف صاف کہہ دیا ہے بانو! اگر ہم اپنے بیٹے کی آزمائش کر سکتے ہیں تو اپنی ذات کو بھی آزمائش میں ڈالنے سے گریز نہیں کریں گے۔ تاریخ ہم پر یہ الزام نہیں لگائے گی کہ ہم نے اپنے بیٹے کی سازش سے ڈر کر اُسے زندگی بھر قید خانے میں بند کر دیا تھا۔ ہم اُسے آزاد کر دیں گے۔ امیر سبکتگین ہر سازش کو ناکام بنا سکتا ہے۔ اور اپنے بیٹے کی سازش کو بھی شکست دینے پر قادر ہے۔

بانو : یہ ایک ماں کی مامتا کی بھی آزمائش تھی۔

سبکتگین : ہاں تم یہ کہہ سکتی ہو۔

(موسیقی جاری ہو جاتی ہے، چند لمحوں کے بعد اس موسیقی کو بگل کی بلند آواز اپنے اندر جذب کر لیتی ہے)

سبکتگین : یہ کیا ہنگامہ ہے ابوالحسن؟

ابوالحسن : حضور! فائق اور ابو علی سمجوری نے بغاوت کر دی ہے۔ اور ان دونوں کی متحدہ فوجیں ادھر بڑھ رہی ہیں۔

سبکتگین : ان میں یہ حوصلہ؟ فوجوں کو فی الفور جمع کرو۔

(بگل کی آواز جو جنگ کے صوتی اثرات میں دب جاتی ہے۔ تلواروں کی جھنکار۔ توپوں کی گھن گرج اور گھوڑوں کے سموں کا شور کئی لمحے جاری رہتا ہے۔ اسی شور میں)

ابوالحسن : حضور! دیکھ رہے ہیں آپ!

سبکتگین : یہ کون شہسوار ہے؟

ابوالحسن : آپ کا بیٹا شہزادہ محمود۔ دیکھئے کس بہادری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ کس طرح دشمن پر چھا گیا ہے۔

(صوتی اثرات تیز ہو جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگتے ہیں۔
پس منظر میں موسیقی)

محمود : لیجئے بابا جان! آپ کے دونوں مجرم حاضر ہیں۔
سبکتگین : مرحبا بیٹے! شاباش۔ انہیں ہماری نظروں سے دُور لے جاؤ۔
محمود : بابا جان! کیا آپ اپنے بیٹے کو اپنی عنایت سے محروم رکھیں گے؟
سبکتگین : کس عنایت سے میرے بیٹے؟
محمود : اپنی اُس تلوار سے جو آپ نے قید خانے میں دینے کا ارادہ کیا تھا۔
سبکتگین : مگر تم نے تو یہ تلوار لینے سے انکار کر دیا تھا۔
محمود : انکار نہیں کیا تھا فقط معذرت چاہی تھی اور وہ صرف اس وجہ سے کہ میں اُس وقت اس تلوار کے قابل نہیں تھا۔ اب میں نے کچھ کر کے دکھا دیا ہے۔ شاید اب میں اس گراں بہا تحفے کے قابل ہو گیا ہوں۔
سبکتگین : شاید نہیں یقیناً تم اس کے قابل ہو۔ ہم اپنے بیٹے کو اپنی تلوار ہی نہیں، سیف الدولہ کا خطاب بھی دیتے ہیں۔

(منظر بدلتا ہے۔ پس منظر میں غم انگیز دھیمی موسیقی)

سبکتگین : اسماعیل بیٹے!
اسماعیل : جی بابا جان!
سبکتگین : میرے قریب آجاؤ۔
اسماعیل : جی ارشاد بابا جان۔
سبکتگین : بیٹا! وہ وقت آگیا ہے جب میں کائنات کی روشنیوں کو چھوڑ کر ایک اَن دیکھی، اَن جانی دنیا کی طرف جا رہا ہوں۔
اسماعیل : یہ نہ کہئے بابا جان۔ ہماری دنیا تاریک ہو جائے گی۔
سبکتگین : ایسی بات تمہیں زیب نہیں دیتی۔ تمہیں تو اب حکومت کی اہم

ذمہ داریاں کا بوجھ اُٹھانا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔

اسماعیل : میں ہمہ تن گوش ہوں بابا جان!

سبکتگین : میرے بعد غزنی اور بلخ کے حکمران تم ہو گے۔

اسماعیل : بابا جان!

سبکتگین : بیٹے! تمہیں وہ ساری ذمّے داریاں دیانت داری کے ساتھ پوری کرنا ہوں گی جو بحیثیت حکمران کے تم پر عائد ہوں گی اور۔

اسماعیل : اور حکم؟

سبکتگین : اپنوں سے نیک اور بہتر سلوک کرنا ہوگا۔

اسماعیل : کوتاہی نہیں ہوگی بابا جان۔

سبکتگین : ابوالحسن کہاں ہے؟

اسماعیل : حاضر ہوں حضور۔

سبکتگین : اس بات کا اعلان کر دو۔ اور اعلان کر دو کہ ہمارے خیر خواہوں کی ساری ہمدردیاں آج سے ہمارے جانشین اسماعیل کے لیے وقف ہوں گی۔ کسی کو بھی سرتابی کی مجال نہیں ہونی چاہیئے۔

ابوالحسن : میں آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔

سبکتگین : ابوالحسن! تمہاری کمزور آواز تمہارے کمزور دل اور بے یقینی کا احساس دلا رہی ہے۔

ابوالحسن : حضور! مجھے حکم کی تعمیل کرنی ہے اور یہ میرا فرض ہے۔

سبکتگین : کیا اس حکم کی تعمیل میں تمہارا دل شامل نہیں ہوگا؟

ابوالحسن : غلام کو اپنے آقا کا ہر حکم ماننا چاہیئے۔

سبکتگین : خیر جاؤ۔ (ذرا سا وقفہ دعائیہ انداز میں) اے خدائے بزرگ و برتر! میرے ملک کو فتنہ و فساد سے بچانا۔ یہ میری ساری عمر کی جد و جہد کا ثمرہ ہے۔ اس کی حفاظت کرنا اے رب ذوالجلال!

بانو : آمین۔

سبکتگین : یہ میں دوسری آواز سن رہا ہوں جو دل سے نکلی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔

بانو : یا امیر! میں نے آپ کی دُعا کی تائید کی ہے۔ اللہ آپ کی سلطنت کو فتنہ و فساد سے بچائے۔

سبکتگین : بانو!

بانو : یہ میرے دل کی آواز ہے۔

سبکتگین : بانو! شاید تم نہیں جانتیں کہ موت کے سائے میں انسان کے حواس بہت تیز ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی آوازیں بھی سن لیتا ہے جو دوسروں کے دلوں میں دبی ہوتی ہیں۔ مجھے تمہاری وہ آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔ جو تمہاری زبان سے بہت دُور ہے۔ کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔

بانو : کچھ نہیں یا امیر!

سبکتگین : تم نہیں بتاتیں تو ہم بتاتے ہیں۔ کیا تم اپنے بیٹے کی حکمرانی کے خواب نہیں دیکھ رہی تھیں، تمہاری اصل آواز کو اِن خوابوں نے روک دیا ہے اور تمہاری نقلی آواز تمہاری زبان سے نکل رہی ہے۔

بانو : یہ بندی کچھ عرض کرے گی تو اسے گستاخی سمجھا جائے گا۔

سبکتگین : نہیں۔ صاف صاف کہو۔

بانو : میں صرف یہ عرض کروں گی کہ محمود میرا بیٹا ہے یا نہیں ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر یہ مسئلہ ضرور اہم ہے کہ وہ آپ کا سب سے بڑا بیٹا ہے اور آپ اسے سیف الدولہ کا خطاب بھی دے چکے ہیں۔ اور کئی جنگوں میں آپ کا دست و بازو بن کر اپنا فرض بھی ادا کر چکا ہے۔ آپ کو اس کی ذات پر اعتماد ہے۔

سبکتگین : بانو!

بانو : حضور!

سبکتگین : میرے پاس تمہاری طویل گفتگو سننے کے لیے وقت نہیں ہے۔

بانو : میں معافی چاہتی ہوں۔

سبکتگین : تم نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے۔
بانو : تو پھر میرے آقا!
سبکتگین : تم جانتی ہو اسماعیل کون ہے؟
بانو : حضور کیا میں یہ بھی نہیں جانتی کہ اسماعیل کون ہے میرا ہی بیٹا ہے۔
سبکتگین : نہیں تمہارا بیٹا نہیں۔ میرے آقا۔ میرے مالک اپتگین کی دختر کا بیٹا ہے کیا تم کہہ سکتی ہو کہ یہ امتیاز کسی اور کو بھی حاصل ہے۔
بانو : نہیں۔
سبکتگین : (جلدی سے) بس یہی ہے ایک امتیاز اور یہ بہت بڑا امتیاز ہے۔
بانو : میں اب کچھ نہیں کہوں گی۔
سبکتگین : اب۔ کچھ اور کہنے سُننے کے لیے وقت بھی نہیں ہے۔ لا الٰہ الا اللہ۔

(بانو کی "میرے آقا" کہتی ہوئی آواز سبکتگین کی آخری آواز میں دب جاتی ہے۔ پھر بانو کی یہ آواز سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں میں مدغم ہو جاتی ہے)

محمود : کیوں ابوالحسن!
ابوالحسن : (سانس پھولی ہوئی) شہزادے بس یہی رُک جائیے۔
محمود : کیوں؟
ابوالحسن : آپ کو معلوم نہیں کہ ——
محمود : مجھے معلوم ہے کہ بابا جان دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں اسی لیے میں فوراً خراسان سے واپس آگیا ہوں۔
ابوالحسن : آپ کو معلوم نہیں ہو گا کہ آپ کے سوتیلے بھائی اسماعیل نے تخت پر قبضہ کر لیا ہے۔

محمود : کیا کہہ رہے ہو تم۔ بابا جان کا سب سے بڑا بیٹا میں ہوں۔ اسماعیل کو ایسی جرأت کیونکر ہوئی؟

ابوالحسن : مگر آپ کے بابا جان اسی کے حق میں وصیت کر گئے ہیں۔

محمود : بابا جان نے اسماعیل کے حق میں وصیت کی ہے؟

ابوالحسن : جی ہاں۔

محمود : میں تو کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ابوالحسن : ایک پیغام آپ کی امی نے بھی دیا ہے۔

محمود : کیا فرمایا ہے انہوں نے؟

ابوالحسن : انہوں نے کہا ہے۔ مجھے اپنے عزیز بیٹے سے وہی توقع ہے جو ایک زابلستانی ماں کو ہونی چاہیے۔ اور زابلستانی ماں باغیرت ہوتی ہے۔

محمود : اور زابلستانی ماں کا بیٹا بھی باغیرت ہوتا ہے۔ میں جائز حق کی خاطر اپنے لہو کا آخری قطرہ بھی بہا دوں گا۔ لیکن۔

ابوالحسن : لیکن۔

محمود : میں اپنے والد بزرگ کی ہر بات کا احترام کروں گا۔ ابوالحسن۔

ابوالحسن : جی!

محمود : کاغذ لو اور لکھو۔ میرے بھائی اسماعیل! بابا جان نے شدت محبت میں تمہیں اپنا جانشین مقرر کر دیا ہے۔ محبت کبھی کبھی نتائج وعواقب کو بُری طرح نظر انداز کر دیتی ہے۔ تم خوب جانتے ہو کہ تم میں امورِ سلطنت چلانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ تم یقیناً اِس سلطنت کو کھو دو گے جو ہمارے والدِ محترم نے ایک عمر کی جدوجہد کے بعد مستحکم کی ہے۔ اگر تمہیں حکمرانی کا شوق ہے تو خراسان چلے جاؤ۔ وہاں تم بلاشرکت غیرے حکمران ہو گے۔ مجھے اُمید ہے تم صحیح سمت میں قدم اُٹھاؤ گے۔ (ذرا وقفہ) لکھ لیا ہے ابوالحسن!

ابوالحسن : جی ہاں۔

محمود : مجھے دو۔

ابوالحسن: لیجئے۔ (ذرا سا وقفہ)

محمود : یہ لو اور جلد جواب لے کر لوٹ آؤ۔

(گزرانِ وقت کے لیے موسیقی جو گھوڑے کی ٹاپوں میں مدغم ہو جاتی ہے)

محمود : کیوں ابوالحسن!

ابوالحسن : مجھ میں یہ جرأت نہیں ہے کہ آپ کی تحریر کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کی تفصیل بتاؤں۔

محمود : اسماعیل کو سلطنت کے بدخواہوں نے گمراہ کر دیا ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا؟

ابوالحسن : اس سے کچھ زیادہ۔

محمود : اس نے تمہارے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا ہے؟

ابوالحسن : اگر ایسا ہوتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ اُس نے آپ کے خط کے ساتھ نہایت غیر مناسب سلوک کیا ہے۔ اِسے تلوار کی نوک سے دو ٹکڑے کر دیا ہے۔ (ذرا سا وقفہ)

اب کیا ارادہ ہے حضور!

محمود : ہمیں ابھی وقت ہرات کی طرف کوچ کرنا ہے۔

(گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور، یہ شور آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے)

محمود : ابوالحسن اب کے اسماعیل نے ہمارے خط کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟

ابوالحسن : پہلے خط کے دو ٹکڑے کئے تھے اس مرتبہ پارہ پارہ کر دیا۔

محمود : افسوس ہماری مصالحانہ کوشش رائیگاں جا رہی ہے۔

ابوالحسن : حضور! وہ سمجھتا ہے کہ غزنی پر اُس کا قبضہ ہے۔ سب کو آپ کے بابا جان کی وصیت معلوم ہو چکی ہے۔ آپ کی مصالحانہ کوششوں کا اس پر بالکل اثر نہیں ہوگا۔ وہ آپ کی طرف سے بالکل بے فکر ہو چکا ہے۔

محمود : ابوالحسن! ہم اسے ایک اور موقعہ دیں گے۔ اگر اس نے تیسری مرتبہ بھی حماقت کا ثبوت دیا تو جس تلوار سے اُس نے ہمارے خطوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔ وہ اس کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے چھین لی جائے گی اور اُس کی قبائے اقتدار کو پُرزے پُرزے کر دیا جائے گا۔

(موسیقی بلند ہوتی ہے اور بلند ہو کر ہنگامۂ دار و گیر میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ یہ ہنگامہ مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتا ہے۔ زنجیروں کی جھنکار)

محمود : آؤ اسماعیل! ہم چاہتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے اس طرح ملیں جس طرح دو بھائیوں کو ملنا چاہیئے مگر تمہارے دماغ میں تو سلطنتِ غزنویہ کے بدخواہوں نے ہمارے خلاف زہر بھر دیا تھا۔ تم نے ہمارے خطوں کی توہین کی اور راہِ راست چھوڑ کر گمراہی کے راستے پر چلنے لگے اور آج شکست کھا کر زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہمارے سامنے بیچارگی کی تصویر بنے کھڑے ہو خاموش کیوں ہو۔ کہو۔ کیا ہم نے درست نہیں کہا تھا؟ کیا ہم نے تمہیں صحیح مشورہ نہیں دیا تھا؟ بولو۔

اسماعیل : کیا میری زنجیروں کی جھنکار نے آپ سے کچھ نہیں کہا؟

محمود : یہ زنجیریں تمہاری ذلت آمیز شکست کا اعلان کر رہی ہیں۔

اسماعیل : ایک فاتح کے لیے اس سے زیادہ شیریں نغمہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

محمود : یہ شیریں نغمہ نہیں ہے۔ شیریں نغمہ وہ ہوتا ہے۔ جس میں محبت اور پیار کی شیرینی اور تر و تازگی ہو۔ ہم تم سے یہی نغمہ سُننا چاہتے تھے۔ مگر تم نے اس نغمے کو ہوس اور حرص کی بوجھل زنجیریں پہنا دیں اور اپنے بڑے بھائی کے خلوص کو نفرت سے ٹھکرا دیا۔

اسماعیل : اب آپ کیا چاہتے ہیں؟

محمود : وہی نغمۂ محبت جو ایک بھائی کو بھائی سے سننا چاہیئے۔

اسماعیل : بھائی کو زنجیریں پہنا کر نغمۂ محبت سُننا چاہتے ہو؟

محمود : نہیں ___ ابوالحسن! فی الفور زنجیریں اُتروا دو۔

(ذرا سا وقفہ)

محمود : اب کہو۔

اسماعیل : کچھ نہیں کہہ سکتا۔

محمود : اسماعیل! محبت کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ یہ خاموشیوں کے سینے سے پھوٹ پڑتی ہے۔ شاید تمہاری آنکھوں اور ہونٹوں پر وہی نغمہ تیر رہا ہے جو ایک روح کی گہرائیوں سے نکل کر دوسری روح میں اُترتا ہے۔ اسماعیل! کیا ہم درست کہہ رہے ہیں؟

اسماعیل : آپ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

محمود : ہم نے بہتر طور پر سمجھ لیا ہے۔ اسماعیل! تم آزاد ہو۔ جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔

(گزرانِ وقت کے لیے ہلکی ہلکی موسیقی۔ دروازے پر دستک)

بانو : محمود! محمود بیٹا!

محمود : امی! آپ! اتنی رات گئے۔ خیر تو ہے؟

بانو : بالکل خیریت ہے۔ پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔

محمود : مگر امی! آپ کو میرے پاس آنے کی ضرورت کیوں ہوئی؟

بانو : میں نے کہا نا۔ پریشانی کی قطعاً کوئی بات نہیں۔

محمود : آپ کا حکم ملتا تو میں فوراً حاضر ہو جاتا۔

بانو : سنو بیٹے! میں وہ خوشی برداشت نہ کر سکی جو ابھی ابھی قدرت نے مجھے دی ہے۔ میں بے تاب ہو کر آ گئی ہوں۔

محمود : فرمائیے امی!

بانو : محمود بیٹے! یہ اُس وقت کی بات ہے جب تم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔

محمود : خواب ؟

بانو : مَیں نے دیکھا کہ ایک بہت اُونچا پہاڑ ہے جس کی چوٹی کے اُوپر ایک ستارہ چمک رہا ہے۔ اور اسکی چمک میں بڑی شان ہے۔ یہ عظمت اور جلال کی چمک ہے۔

محمود : یہ تو ایک پُرانی بات ہے امّی!

بانو : مَیں پرانی نہیں نئی بات سُنانے آئی ہوں۔

محمود : نئی بات۔

بانو : نیا خواب جو مَیں نے ابھی ابھی دیکھا ہے مَیں نے دیکھا کہ وُہی بلند اور شاندار پہاڑ ہے اور اسکے اسکی چوٹی پر کوئی روشن ستارہ نہیں سورج ہے جو بڑی آب و تاب سے چمک رہا ہے۔

محمود : پہلے ستارہ اور اب سورج۔ کیوں امّی!

بانو : پہلے خواب کے چند روز بعد تم دنیا میں آگئے تھے۔ قدرت نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ غزنی کے آسمان پر ایک ستارہ چمکنے والا ہے۔ اور یہ ستارہ تم تھے اور اب خدائے کریم نے مجھے یہ خوشخبری دی ہے کہ وہ ستارہ آفتاب بن گیا ہے۔ جو غزنی کی فضاؤں میں روشن ہے اور اس کی شعاعیں دُور دُور تک پھیل جائیں گی۔

محمود : امّی! اگر قدرت مجھ سے کوئی کام لے اور مجھے اس کام کی توفیق دے تو یہ اس کی مہربانی ہے۔ بندہ نوازی ہے۔

بانو : میرا دل کہتا ہے اللہ تم سے کوئی بہت بڑا کام لے گا۔

محمود : وہی اللہ بڑے کام کی توفیق بھی دے سکتا ہے۔

بانو : مَیں دن رات تمہارے لیے دُعا کروں گی۔

محمود : مَیں اس دعا کا پہلے بھی محتاج تھا اور آج بھی ہوں۔ اچھا امّی! چلیے۔ میں آپ کو چھوڑ آؤں۔

بانو : اگر مَیں تنہا آسکتی ہوں تو تنہا واپس نہیں جا سکتی ؟

محمود : پھر بھی امی !

بانو : مَیں تنہا ہی جاؤں گی بیٹے !

(ذرا سا وقفہ)

محمود : (دُعائیہ انداز میں) اے ربِ قدیر! میری ماں نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ اگر تو مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو مجھے یقین کی قوت عطا فرما۔ مجھے ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت دے۔ میرا جو قدم بھی اُٹھے آگے ہی اُٹھے۔ اب رب العالمین یہ توفیق تو دے سکتا ہے۔ صرف تو دے سکتا ہے۔

(آخری فقرے پر گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور بلند ہونے لگتا ہے)

محمود : (کڑکتی ہوئی آواز میں) شاباش دلیرو! دیکھنا قدم رُکنے نہ پائیں آگے ہی آگے بڑھتے جاؤ۔ خدا کی رحمت ہمارے ساتھ ہے۔ فتح و نصرت ہمارے ساتھ ہے۔ ماں کی دُعا ہمارے ساتھ ہے۔

(گھوڑوں کی ٹاپیں تیز سے تیز ہو جاتی ہیں۔ قریوں کی گھن گرج۔ لڑائی کا ہنگامہ)

ابوالحسن : سلطانِ معظم! سیستان کی فتح مبارک ہو۔

محمود : الحمد للہ۔

(پس منظر میں جنگ کا ہنگامہ جاری رہتا ہے۔ گھوڑوں کے دوڑنے کا شور ہوتا رہتا ہے)

ابوالحسن : سلطان غازی! خوارزم آپ کے قدموں میں ہے۔

محمود : خدائے قدوس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

(گھوڑوں کے دوڑنے کا شور)

ابوالحسن : ہمدان فتح ہو گیا ہے سلطانِ ذی شان !

محمود : یہ سب اُسی کا کرم ہے۔

(جنگ کا ہنگامہ)

ابوالحسن : اصفہان آج حضور کے قبضے میں ہے۔

محمود : اس خدائے لایزال کا شکر ہے جس نے اپنے اس حقیر بندے کو اصفہان پر قبضہ کرنے کی توفیق دی ہے۔

(گھوڑوں کے دوڑنے کا شور)

محمود : ابوالحسن!

ابوالحسن : حضور!

محمود : رے پر کون حکمران ہے؟

ابوالحسن : آزاد الدولہ کا کمسن بیٹا، مگر اصل حکومت اس کی ماں کی ہے۔

محمود : فوجوں کو حملہ کرنے سے روک دو۔

ابوالحسن : جیسا حکم۔

(ہنگامہ تھم جاتا ہے)

محمود : ملکہ کو اطلاع دو کہ ہماری اطاعت قبول کرلے ورنہ ہم حملہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ تحریر خود لے جاؤ اور جواب لے کر آؤ۔ رات ہو گئی ہے۔ اب سپاہی آرام کریں۔

(دور سے قدیم افغانی اور ایرانی موسیقی چند لمحے جاری رہتی ہے۔ پھر موسیقی تھم جاتی ہے۔ سلطان تالی بجاتے ہیں۔ ایاز اندر آتا ہے)

محمود : کون ہو تم!

ایاز : سلطان آپ مجھے بھول گئے ہیں۔ میں ایک غلام ہوں جسے آپ کے لیے آپ کی فوج کا ایک افسر خرید کر لایا تھا۔

محمود : تم یہاں ہمارے خیمے کے باہر کیا کر رہے ہو؟

ایاز : وہی جو ایک غلام کو کرنا چاہیے۔

محمود : غلام کیا کرتا ہے؟

ایاز : اپنے آقا کی حفاظت۔

محمود : ہمارے خیمے کے دروازے پر غیاث نہیں ہے؟

ایاز : وہ دو راتوں سے جاگتا رہا ہے۔ میں نے اُسے آرام کرنے کیلئے بھیج دیا تھا۔

محمود : اور یہ موسیقی کیوں بند ہو گئی ہے! کس نے بند کی ہے؟

ایاز : غلام نے۔

محمود : وہ کس لیے کس کے حکم سے ۔ ہمارے جاں نثار سپاہی اپنا دل بہلا رہے تھے انھیں روکنے والے تم کون ہوتے ہو؟

ایاز : حضور میں آپ کا ایک ادنیٰ غلام۔

محمود : ہم پوچھتے ہیں تم نے انھیں منع کیوں کیا ہے؟

ایاز : یہ سوچ کر منع کیا ہے کہ حضور کے آرام میں خلل نہ پڑے۔

محمود : تمہیں ہماری فکر کیوں ہوئی۔ ہمارے سپاہیوں کی کیوں نہ ہوئی؟

ایاز : غلام اپنے آقا ہی کی فکر کرتا ہے۔

محمود : انھیں ہمارا حکم پہنچا دو کہ اپنا دل بہلائیں۔

ایاز : جیسا حکم۔

محمود : اور تم۔

ایاز : ارشادِ عالی۔

محمود : دروازے پر پہرہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایاز : غلام التماس کرتا ہے کہ اسے اس کے فرض سے نہ روکیں۔

محمود : کیا کہا؟

ایاز : حضور میرا جو فرض ہے وہ میں ادا کروں گا۔

محمود : جب ہم کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے تو۔

ایاز : یہ ضرورت آقا نہیں غلام محسوس کرتا ہے۔

محمود : جاؤ۔

(وقفہ۔ موسیقی پھر شروع ہو جاتی ہے سلطان تالی بجاتے ہیں۔ ایاز آتا ہے)

ایاز : بحکم حضور۔

محمود : تم ہو — نام کیا ہے تمہارا؟

ایاز : غلام کو ایاز کہتے ہیں۔

محمود : ایاز!

ایاز : ارشاد حضور۔

محمود : آج سے تم غلام نہیں ہو۔

ایاز : مگر حضور غلام سپتری نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

محمود : آزاد۔

ایاز : حضور! مجھے چلے جانے کا حکم دے رہے ہیں؟

محمود : اگر تم جانا نہیں چاہتے تو یہیں رہو۔

ایاز : عزت افزائی کا شکریہ۔

محمود : ہم تمہیں اپنے تمام خادموں پہ افسر مقرر کرتے ہیں۔

ایاز : حضور کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

محمود : اب جاؤ اور دیکھو ابوالحسن واپس آیا ہے یا نہیں۔

ایاز : ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

(پس منظر میں موسیقی جاری رہتی ہے یہاں تک کہ صبح کی اذان بلند ہوتی ہے۔ موسیقی یک لخت بند جاتی ہے۔ اذان کی آواز جاری رہتی ہے۔ اذان کے بعد تھوڑا سا وقفۂ سکوت۔ اس کے بعد سلطان کی دعائیہ آواز اُبھرتی ہے)

محمود : اے خدائے ذوالجلال و ذوالمنن! اپنے اس حقیر بندے کو اسلام کی خدمت کی توفیق دے۔ وہ روشنی دے جس سے میں کفر کے اندھیرے دُور کر دوں۔ جو کچھ تو نے دیا ہے اس کے لیے یہ عاجز بندہ تیرا شکرگزار ہے اور تیری بےپایاں رحمتوں کا اُمیدوار ہے۔

(ذرا سا وقفہ۔ قدموں کی آہٹ)

محمود : ابوالحسن؟

ابوالحسن : جہاں پناہ!

محمود : رے کی حکمران نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے کیا؟

(ابوالحسن خاموش رہتا ہے)

ابوالحسن : خاموش کیوں ہو جواب کیوں نہیں دیتے تم نے اُسے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا؟

ابوالحسن : ملکہ کے دماغ میں فتور ہے حضور!

محمود : کیا کہا ہے اس نے؟

ابوالحسن : سلطانِ معظم! جیسا کہ میں نے کہا ہے اس کا دماغ مختل ہو گیا ہے۔

محمود : صحیح صحیح بتاؤ کہ اس نے جواب کیا دیا ہے؟

ابوالحسن : میں نے حضور کا پیغام اُس کو سُنا دیا تھا۔

محمود : اور اس نے جو کچھ کہا ہے وہ لفظ بہ لفظ ہمیں سُنا دو۔

ابوالحسن : اس نے کہا ہے — اگر میرے شوہر کی زندگی میں یہ پیغام سنایا جاتا تو اس کے نتائج بڑے خوفناک ہوتے مگر اب حالات وہ نہیں رہے، اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ سلطان محمود ایک نہایت بہادر حکمران ہیں اور جس قدر بہادر ہیں اسی قدر عقل مند بھی ہیں۔ اگر وہ حملہ کر کے میرا ملک فتح کر لیتے ہیں تو ایک کمزور عورت کو شکست دینا کونسی ایسی بہادری ہے جس پر فخر کیا جائے۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے تو بہادر سلطان کی شہرت ہمیشہ کے لیے داغدار ہو جائے گی۔ تاریخ انھیں ایک بزدل حکمران تصوّر کرے گی۔ وہ خلقِ خدا کی نظروں سے گر جائیں گے۔ کیا وہ اس کے لیے تیار ہیں؟

محمود : یہ کہا ہے ملکہ نے؟

ابوالحسن : میں نے جہاں پناہ کے ارشاد کی تعمیل میں ایک ایک لفظ کہہ دیا ہے۔

(ذرا سا وقفہ)

محمود : ابوالحسن !

ابوالحسن: حضور !

محمود : ایک مرتبہ اور جاؤ ملکہ کے پاس۔

ابوالحسن : وہ بڑی ضدی عورت معلوم ہوتی ہے بہتر ہے کہ فوراً حملہ کردیا جائے ویسے حضور! جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ یہ حضور کے نمک خوار کا مشورہ ہے۔

محمود : نہیں ابوالحسن! حملہ نہیں ہوگا جاؤ اس سے کہہ دو کہ سلطان محمود تم جیسی بلند حوصلہ اور عقل مند عورت کو کسی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔

ابوالحسن : جیسا حکم۔ ایک اور خبر ہے حضور!

محمود : کونسی خبر؟

ابوالحسن : خراسان کے حکمران ایبک خاں نے اُن تعلقات کو توڑ دیا ہے جو آپ نے اُس سے قائم کئے تھے اور اب وہ صریحاً بغاوت کر رہا ہے۔

محمود : بغاوت کر رہا ہے؟

ابوالحسن: جی ہاں۔

محمود: تم اپنا فرض ادا کرو ہم آج ہی اس پر چڑھائی کر دیں گے۔

(گھوڑوں کی ٹاپیں۔ شور و داروگیر چند لمحوں کے بعد یہ ہنگامہ کسی حد تک مدھم پڑ جاتا ہے)

ابوالحسن: مبارک ہو جہاں پناہ!

محمود : خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں فتح دی مگر ابوالحسن! ہم صرف خراسان فتح کرنے نہیں آئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس بدباطن شخص کو ایک ایسا سبق دیں جسے وہ ساری عمر نہ بھول سکے۔ کہاں ہے وہ؟

ابوالحسن: وہ شمال کی طرف بھاگ رہا ہے۔

محمود : ہم اس کا تعاقب کریں گے۔

ابوالحسن : ادھر موسم سخت خراب ہے۔ سپاہیوں کیلئے تعاقب کرنا مشکل ہو گا۔

محمود : موسم کیسا بھی ہو، ہم اسے گرفتار کئے اور سزا دیئے بغیر ہرگز اپنے قدم نہیں روکیں گے۔

(گھوڑوں کی ٹاپیں، تیز ہوا کا شور)

ابوالحسن : حضور! آپ دیکھ رہے ہیں سردی شدید ہے۔ سپاہی کانپ رہے ہیں۔

محمود : ہم دیکھ ہی نہیں رہے محسوس بھی کر رہے ہیں۔

ابوالحسن : دو راتیں اور دو دن گزر چکے ہیں۔

محمود : ابھی نہ جانے کتنے دن اور کتنی راتیں اور گزریں گی۔

ابوالحسن : آگے موسم اور بھی خراب ہے اور سخت خطرناک ہے۔

محمود : ابوالحسن! ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔

(گھوڑوں کی ٹاپیں، تیز و تند ہوا۔ بادل کی خوفناک گرج۔ بارش کا زور، شدید قسم کا طوفان)

ابوالحسن : (لرزتی ہوئی آواز میں) عالی جاہ! سپاہی آگے جانے سے قاصر ہیں۔

محمود : سپاہی آگے جانے سے خوفزدہ ہیں۔ یہ کہنا چاہتے ہو تم؟

ابوالحسن : جہاں پناہ! آپ دیکھتے نہیں کہ طوفان کی کیا کیفیت ہے۔ ایسے میں آگے بڑھنا موت کو دعوت دینا ہے۔

محمود : سپاہی اور موت سے ڈرے!

ابوالحسن : ہماری فوج نے ہر جگہ دادِ شجاعت دی ہے۔

محمود : مگر آج؟

ابوالحسن : میں نے عرض کیا ہے کہ ——

محمود : خیر کوئی بات نہیں۔ ہمیں اپنے دشمن کا تعاقب کرنا ہے۔ فوج نہیں جاتی تو ہم جائیں گے۔

ابوالحسن: حضور آپ۔

محمود: (الفاظ کاٹ کر) تنہا جائیں گے۔ محمود رکنا نہیں جانتا۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔

(طوفان کی شدت۔ اس طوفانِ آب و باد میں محمود کے گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز چند لمحے جاری رہتی ہے۔ ایاز کی آواز بلند ہوتی ہے)

ایاز: رُک جائیے حضور!

محمود: کون ہے؟

ایاز: حضور کا غلام۔

محمود: ایاز! تم یہاں؟

ایاز: جہاں آقا جائے وہاں غلام نہ جائے یہ کیسے ہوسکتا ہے! حضور! اب آپ کو آگے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

محمود: کیوں ضرورت نہیں ہے؟

ایاز: حضور جس مقصد کے لیے تنہا جارہے تھے وہ اس غلام نے پورا کر دیا ہے یہ دیکھئے باغی ایبک خاں۔

محمود: تم نے اسے گرفتار کرلیا ہے۔

ایاز: تعاقب کرکے۔

محمود: شاباش! ایاز! ہم تم پر بہت خوش ہیں۔ ہم تمہاری ذات پر پورا پورا اعتماد کریں گے۔

ایاز: غلام ثابت کرے گا کہ وہ ہر طرح آقا کے اعتماد کے قابل ہے۔

محمود: انشاء اللہ۔

ایاز: انشاء اللہ۔

(گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آواز چند لمحے یہ آواز جاری رہتی ہے پھر محمود کی آواز گونجتی ہے)

محمود : ایاز! اِدھر آؤ۔ ہمارے قریب کھڑے ہو جاؤ۔ (بلند آواز سے)
محمود کے سپاہیو! تم نے طوفان کے ڈر سے اپنے قدم روک لیے تھے۔ تم نے سمجھا تھا کہ آگے بڑھو گے تو تباہی کے غار میں گر پڑو گے! یہ بہادری نہیں، بزدلی ہے۔ سپاہی موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا ہے۔ اگر تم موت سے ڈرتے ہو تو جاؤ اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ ہم تمہیں الوداع کہنے کے لیے تیار ہیں۔

(طوفان ختم ہو چکا ہے۔ مگر تیز ہوا کا شور برپا ہے)

جاؤ خدا حافظ!

ابوالحسن : حضور اجازت ہو تو بندہ کچھ عرض کرے۔

محمود : کہو۔

ابوالحسن : سپاہی واپس جانا نہیں چاہتے۔

محمود : واپس جانا نہیں چاہتے۔ موت سے ڈرتے ہیں اور گھروں میں پناہ لینا نہیں چاہتے۔ یہ کیا معمہ ہے؟

ابوالحسن : وہ پشیمان ہیں۔

محمود : تم آگے سے ہٹ جاؤ۔ ہم براہِ راست اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہیں۔ دوستو! کیا تم سمجھتے ہو طوفان سے خوفزدہ ہو کر گھروں میں جا بیٹھو گے تو موت سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ کیا موت تمہارے گھروں کے اندر نہیں جا سکتی؟ کیا موت تمہارے گھروں کے بند دروازے دیکھ کر پلٹ جائے گی۔ جواب دو۔ ہاں کہتے ہو یا۔

("نہیں نہیں" کا شور)

دوستو! جب موت تمہارے گھروں کے اندر بھی جا سکتی ہے تو بہادری کی موت کیوں نہ مرو۔ کیوں نہ اپنی جان اسلام پر قربان کر دو؟ کیوں نہ اپنے لہو سے کفر کے

اندھیروں میں ایمان کی روشنی پھیلا دو، شہادت کی موت ہزار زندگیوں سے بہتر ہے۔

("جی ہاں" کا شور)

تو آؤ اللہ کے راستے میں آگے بڑھیں۔

(کوچ کا نقارہ زور سے بجتا ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں۔ پانی کا شور۔ پانی کے اس شور میں موسیقی کبھی بلند ہوتی ہے اور کبھی تھم جاتی ہے۔ پانی کا شور آہستہ آہستہ کم ہونے لگتا ہے۔ صبح و شام کے صوتی اثرات جو بہ تکرار اُبھرتے ہیں)

محمود : ابوالحسن! ہمیں دیہند کے اس مقام پر پہنچے کتنے دن گزر گئے ہیں؟

ابوالحسن : چالیس۔

محمود : چالیس دن گزر گئے ہیں۔ دریائے سندھ عبور کر کے آئے تھے اور ابھی تک یہیں ہیں۔

ابوالحسن : حضور، راجہ انند پال اس جنگ کو اپنی زندگی کی آخری جنگ سمجھ چکا ہے۔ اور اس کے لیے ہر ممکن تیاری کر رہا ہے۔ اس نے اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج اور اجمیر کے راجاؤں کو مدد کے لیے پکارا ہے اور ان تمام راجاؤں نے اپنی فوجیں بھیجنا شروع کر دی ہیں۔

محمود : فوجیں آ چکی ہیں؟

ایاز : مجھے جو خبر ملی ہے اس کے مطابق فوجیں دھڑا دھڑ آ رہی ہیں۔

محمود : کوئی بات نہیں — ابوالحسن!

ابوالحسن : حضور!

محمود : تمہارے ذمے یہ کام ہے کہ فوجوں کے دونوں جانب گہری خندقیں کھدوا دو۔

ابوالحسن : بہتر حضور!

محمود : اور ایاز!

ایاز : ارشاد حضور!

محمود : سب تیر اندازوں کو ایک جگہ جمع کر دو اور جب ہم حکم دیں یہ

سب دشمن پر تیروں کی بارش برسادیں۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

(بگل۔ ہنگامۂ دار و گیر۔ سلطان کی بلند آواز گونجتی ہے)

محمود : تیر برساؤ۔ عقب سے حملہ کرو۔

(جنگ کا ہنگامہ تیز ہو جاتا ہے۔)

محمود : ایاز!

ایاز : حضور آپ۔

محمود : تیر برسانے کی رفتار سُست ہے۔

ایاز : آپ پیچھے ہٹ جائیں۔

(جنگ کا ہنگامہ جاری رہتا ہے پھر مدھم پڑنے لگتا ہے۔ اسلامی فوج نعرۂ تکبیر بلند کرتی ہے)

محمود : اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ بہت عظیم ہے جس نے اپنے اس حقیر بندے کو فتح بخشی ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

(ذرا سا وقفہ۔ پس منظر میں موسیقی)

ابوالحسن : حضور! یہ فتح تاریخ کی عظیم فتح ہے۔

محمود : ہر فتح عظیم ہے کہ یہ خدائے عظیم نے ہمیں دی ہے۔ ابوالحسن!

ابوالحسن : ارشادِ عالی!

محمود : اللہ نے مجھے ہمیشہ نوازا ہے۔ میں ہوں کیا۔ ایک بندۂ ناچیز۔ میرے دل کی آرزو ہے کہ اظہارِ تشکر کے لیے کچھ کروں۔ مشورہ دو مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

ابوالحسن : حضور! بہتر سمجھتے ہیں۔

محمود : ایاز! تم کیا کہتے ہو۔

ایاز : میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

محمود : تم دونوں مشورہ نہیں دے سکے۔ اللہ نے ہمیشہ میری راہنمائی کی ہے وہ اب بھی میری راہنمائی کرے گا۔

(دوُور سے اذان کی آواز آتی ہے)

الحمد للہ! اللہ نے اپنے بندے کی راہنمائی کر دی۔ مَیں شکرانے کے طور پر غزنی میں ایک شاندار مسجد تعمیر کراؤں گا۔ جس کے بلند مینار سے موذن دن میں پانچ بار اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلائے گا۔

(وقفہ پس منظر میں ہلکی ہلکی موسیقی)

ایاز : غیاث! حضور کیا کر رہے ہیں؟

غیاث : نماز سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہیں۔

ایاز : سو رہے ہیں۔

غیاث : شاید۔

ایاز : دیکھو۔

غیاث : مَیں اندر نہیں جا سکتا جب تک وہ خود نہ بلائیں۔

(اندر سے سلطان محمود کی آواز آتی ہے)

محمود : کون ہے؟

ایاز : (ذرا بلند آواز میں) مَیں ہوں۔

محمود : ہم آتے ہیں۔ (وقفہ) کیا ہے ایاز؟

ایاز : حضور! ایک لڑکی آئی ہے دور دراز کا سفر طے کر کے۔ مَیں نے اس سے بہتیرا پوچھا کہ حضور سے کیوں ملنا چاہتی ہے مگر اس نے بتایا نہیں کہتی ہے میں خود کہوں گی۔

محمود : ہم خود پوچھیں گے۔ کہاں ہے! بلاؤ۔

ایاز : غیاث! باہر لڑکی کھڑی ہے۔ بلا لاؤ۔

غیاث : بہتر۔ (وقفہ)

(پریتما آتی ہے)

محمود : کیوں لڑکی؟

پریتما : دھن ہو سلطان غازی! دھن ہو۔

محمود : نام کیا ہے تمہارا ؟

پریتما : پریتما۔

محمود : لڑکی ! بیٹھ جاؤ۔ اور اطمینان کے ساتھ کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔

پریتما : میں بڑی دکھی ہوں۔ میرے ساتھ بڑا انیائے ہوا ہے۔

(پریتما رونے لگتی ہے)

محمود : دیکھو روؤ نہیں۔ ہم تمہاری ہر بات سنیں گے۔ اپنی طرف سے تمہارا دُکھ دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔

پریتما : غازی سلطان ہیں۔

محمود : ہاں تم۔

پریتما : میں ایک گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ پتاجی ایک کسان تھے۔ ماتاجی مجھے پیدا کر کے مر گئی تھیں۔

محمود : اوہو۔

پریتما : مجھے میرے پتاجی نے پال پوس کر بڑا کیا۔

محمود : پالنے والا تو وہ اللہ ہے جو سب کو پالتا ہے۔ سب کو رزق دیتا ہے۔

پریتما : مجھے بچپن ہی سے ناچنے گانے کا بڑا شوق تھا۔ سارے گاؤں میں مجھ جیسی ناچنے گانے والی کوئی نہیں تھی۔ اور ایک روز۔

(فیڈ آؤٹ فیڈ ان دروازے پر دستک)

بھاگوت : کون ہے ؟

چرن : میں ہوں۔

بھاگوت : کیا ہے ؟

چرن : یہ بھاگوت کسان کا گھر ہے کیا ؟

بھاگوت : ہاں۔ میں بھاگوت ہوں۔ تم کون ہو ! کہاں سے آتے ہو۔

چرن : چرن میرا نام ہے۔ تھوڑے دن ہوئے اس گاؤں میں آیا ہوں۔ سالوں پہلے میرا پریوار یہاں رہتا تھا۔

بھاگوت : بات کیا ہے؟

چرن : بھاگوت! جب سے آیا ہوں تمہاری بیٹی کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ کہتے ہیں بہت اچھا ناچتی ہے۔ گاتی ہے۔

بھاگوت : اسے گانے ناچنے کا شوق ہے۔

چرن : جب اتنے گُن ہیں اس میں تو گاؤں میں کیوں بیٹھی ہے؟

بھاگوت : تو کیا کرے؟

چرن : وہاں جائے جہاں اسے دولت ملے۔

بھاگوت : بھگوان نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔

چرن : کیسی بات کرتے ہو بھاگوت۔ تمہاری ساری عمر بیت گئی ہے محنت کرتے۔ آج بیمار پڑ جاؤ تو کیا کرو گے۔ پیسہ پاس ہو گا تو سب بھاگے آئیں گے۔ میری مانو! لڑکی کی عمر خراب نہ کرو۔

(کسی قدر زور سے گھنگھروؤں کی آواز)

بھاگوت : یہ گھنگھروؤں کی آواز۔

چرن : پاگل ہے۔ کسی وقت بھی گھنگھرو پاؤں سے نہیں اُتارتی۔

بھاگوت : تمہاری لڑکی ہے۔

چرن : اور کون ہو گی؟

بھاگوت : بلاؤ اسے۔

چرن : ادھر ہی آتی ہے گی۔

(ذرا سا وقفہ جس میں گھنگھروؤں کی آواز نزدیک تر آجاتی ہے)

پریتما : پتاجی! سُرجو نے دودھ کے پیسے دے دیئے ہیں۔ دے دوں تمہیں؟

چرن : پریتما!

پرتیما : پتاجی یہ کون ہے؟

بھاگوت : تمہارے ناچ گانے کی تعریف سن کر آیا ہے۔

چرن : مَیں نے تمہارے پتاجی سے کہا ہے کہ تمہاری بیٹی میں بڑے گُن ہیں۔ اس کی بڑی قدر ہو سکتی ہے۔ اسے بڑی عزت اور دولت مل سکتی ہے۔

پرتیما : کہاں؟

چرن : سومنات کے مندر میں۔

پرتیما : یہ کیا ہے!

چرن : تُو تو کنوئیں کی مینڈک ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ سومنات کا مندر کیا ہے۔ ارے یہاں ہزاروں دیوداسیاں ہیں جو دولت سے مالا مال ہیں۔

پرتیما : یہ کرتی کیا ہیں۔

چرن : مندر میں ناچتی ہیں۔

پرتیما : بس؟

چرن : اور کیا!

پرتیما : مَیں جاؤں گی۔ پتاجی! مَیں جاؤں گی!

(فیڈ آؤٹ۔ فیڈ اِن)

پرتیما : تو سلطان غازی! مجھے وہ آدمی سومنات کے مندر میں لے گیا۔ شروع شروع میں مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میرا باپو بھی بہت خوش رہا۔ مگر۔

محمود : مگر کیا!

پرتیما : یہ سب دھوکا تھا۔ مَیں ایک بہت بڑے جال میں پھنس گئی تھی۔ مندر کے پجاریوں نے مجھے تباہ و برباد کر دیا۔ مَیں مندر سے بھاگ جانا چاہتی تھی اور بھاگ آئی اور باپو سے کہہ دیا۔ مجھے واپس گاؤں میں لے چلو۔ پر ان راکششوں نے پیچھے کر کے ہمیں پکڑ لیا۔ باپو کو مار ڈالا اور مجھے زبردستی مندر میں لے گئے۔

محمود : اوہو۔

پریتما : وہ ہر گھڑی میرا خیال رکھتے تھے۔ پر ایک رات میں پھر نکل آئی۔ بھاگتی رہی چھپ چھپ کر۔ راستے میں ایک جگہ چھپی ہوئی تھی کہ ایک پرش نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے میری بپتا سنی تو بولا۔ لڑکی! جا سلطان غازی کے پاس جا۔ وہی تیری رکشا کریں گے اور کوئی نہیں کر سکتا اور میں آ گئی ہوں۔

محمود : تُو نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے لڑکی!

پریتما : میں اپنی مری ہوئی ماتا اور مرے ہوئے پتا جی کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے سچ بولا ہے۔ میں بڑی دکھیاری ہوں سلطان غازی!

(پریتما رونے لگتی ہے)

محمود : رو نہیں بیٹی!

پریتما : (لہجے میں حیرت) آپ مجھے بیٹی۔

محمود : جب تم پناہ ڈھونڈنے آئی ہو تو ہم تمہیں پناہ دیں گے۔

پریتما : پناہ دیں گے؟

محمود : باپ بن کر پناہ دیں گے۔ آج سے تم ہماری بیٹی ہو۔

پریتما : ہیں۔ ہیں (پریتما فرطِ تاثر میں فقرہ مکمل نہیں کر سکتی)

محمود : جب تک ہم زندہ ہیں تو ہماری حفاظت میں رہے گی۔ (بلند آواز میں) غیاث!

(غیاث آتا ہے)

غیاث : حضور!

محمود : اسے اندر لے جاؤ۔

غیاث : بہتر حضور!

(گزرانِ وقت کے لیے موسیقی جو کسی لمحے جاری رہتی ہے۔ موسیقی ذرا تھمتی ہے تو)

محمود : غیاث!

غیاث : حضور!

محمود : ابوالحسن اور ایاز آ گئے ہیں؟

غیاث : وہ باریابی کے منتظر ہیں۔

محمود : بلاؤ۔

(ذرا سا وقفہ۔ ابوالحسن اور ایاز آتے ہیں)

محمود : ادھر آؤ۔ ابوالحسن! اور تم بھی ایاز! ہم ایک الجھن میں گرفتار ہیں۔

ایاز : وہ کونسی الجھن ہے جس میں سلطان گرفتار ہیں۔

محمود : جب سے یہ لڑکی آئی ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں یہ ایک مظلوم لڑکی ہے جو بھاگ آئی ہے۔ اور کتنی لڑکیاں ہوں گی جن پر ظلم ہو رہا ہے۔ جو ظلم کی چکی میں پس رہی ہیں۔ جو بھاگ نہیں سکتیں اور کہیں بھی پناہ نہیں ڈھونڈ سکتیں۔

ایاز : حضور! میں نے جاسوسوں کے ذریعے کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ پتہ چلا ہے کہ یہاں ایک بہت بڑے بت کو پوجا جاتا ہے۔ اور ہر روز ہزاروں انسان اس پر اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔

محمود : یہ اس سے بھی بڑا ظلم ہے۔

ابوالحسن : اور میرے جاسوسوں نے بتایا ہے کہ اس بت کے پجاریوں کا عقیدہ ہے کہ یہ خدا ہے۔

محمود : بے جان بُت خدا ہے؟

ابوالحسن : یہی ان کا عقیدہ ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ جھوٹا خدا ہر موقع پر ان کی حفاظت کرتا ہے۔

محمود : یہ ظلم ناقابلِ برداشت ہے۔ ہماری تلوار اگر اس بُت کو پاش پاش نہیں کر سکتی تو یہ لوہے کا ایک بے کار ٹکڑا ہے۔ ہم کفر کے مجسمے کو ریزہ ریزہ کر کے ہی دم لیں گے۔ فوجوں کو تیاری کا حکم دو — آج ہی — اسی وقت! — اسی گھڑی۔

(طبل زور سے بجایا جاتا ہے۔ سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کا شور۔ یہ شور تیز موسیقی میں تحلیل ہو جاتا ہے اس موسیقی میں سومنات کے مندر کے پجاریوں کی سخت گھبرائی ہوئی آوازیں ابھرتی ہیں۔ "وہ آ گیا۔ ملیچھ آ گیا۔ دروازے بند کر دو" مسلمان

فوج کے تکبیر کے نعرے جواب دروازے بند ہو جانے کی وجہ سے مندر سے سنائی دیتے ہیں۔ گھنٹیاں زور زور سے بجنے لگتی ہیں۔ مندر کے مہا مہنت کی آواز اُبھرتی ہے)

مہا مہنت : ہے سومنات! ہے مہادیو! ہے مہاشکتی!

ایک مہنت : ہے پالن ہار! ہے دیالو، ہے بھگوان!

مہا مہنت : ہے مہادیو! تیرے پوتر استھان پر اک ملیچھ حملہ کر رہا ہے۔ اسے تباہ کر دے۔ ملیامیٹ کر دے۔

مہنت : ہے دیوتاؤں کے دیوتا! بجلی گرا اور اسے خاک سیاہ کر دے۔

مہا مہنت : غصے کی آگ بھڑکا۔ ملیچھ کو بھسم کر دے۔

مہنت : بھسم کر دے۔

(بہت سارے پجاری "بھسم کر دے۔ بھسم کر دے" کا شور مچاتے ہیں)

مہا مہنت : دیوتا! دیکھ وہ ملیچھ آ رہا ہے۔

مہنت : آ رہا ہے۔

مہا مہنت : تیرے غصے کی آگ کیوں نہیں بھڑکتی!

مہنت : ہے مہاشکتی۔

ایک اور مہنت : ہے مہادیو!

ایک اور مہنت : ہے سومنات! ہے سومنات! راکھشوں کو مارنے والے! ملیچھوں کا ستیاناس کرنے والے۔

مہا مہنت : ہے مہادیو! ہے مہادیو!

(سب پجاری زور زور سے پکارتے ہیں "ہے مہادیو! ہے مہادیو! والو اور اگنی جل کے دیوتا! ساری شکتیوں کے دیوتا!" دروازے پر زور زور سے ضربیں۔ پجاریوں کی التجائیہ آواز زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔ پس منظر میں گھنٹیاں زور زور سے بجتی ہیں۔ دروازے کے گرنے کا شور۔ سلطان کی فوج کا پُرجوش

نعرہ تکبیر۔ پجاریوں میں بھگدڑ)

مہا مہنت: ہے سلطان! واپس چلا جا۔ واپس چلا جا۔ جان کی خیر چاہتا ہے تو چلا جا۔

محمود : پتھر کے، اس بے جان بت سے ڈر کر، محمود کا قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتا!

مہا مہنت: مہا دیو جلا کر بھسم کر دے گا۔

محمود : تو کہو اپنے مہادیو سے۔ ہمیں جلا کر بھسم کر دے۔

مہا مہنت۔ سلطان ٹھہ۔

محمود : محمود اپنے خدائے قادر و قدیر کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہی خدا زندگی اور موت دیتا ہے۔ وہی سب طاقتوں کا مالک ہے۔ وہی ہمارا سچا مالک ہے۔ اپنے اس جھوٹے خدا سے کہو مجھے روک دے۔ کہو اس سے۔ چپ چاپ کیا تماشا دیکھ رہا ہے۔ یہ تمہارا کیسا خدا ہے کہ ہاتھ تک نہیں ہلاتا۔

مہا مہنت: پیچھے ہٹ جاؤ۔ ہمارے پوتر استھان کو بھرشٹ مت کرو۔

محمود : کون روک سکتا ہے ہمارے قدم۔ کون ہمارے ہاتھوں کو پکڑ سکتا ہے۔ ہماری تلواروں کو نیچے گرا سکتا ہے؟

(اب کے مہا بولے گا تو اس کی آواز میں لجاجت اور ملائمت ہوگی)

مہا مہنت: سلطان ٹھہرو! تمہیں کیا چاہیئے۔

محمود : ہمیں کیا چاہیے یہ تم سنو گے نہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔

مہا مہنت: سلطان رک جاؤ۔ میری سنو! اپنی تلواریں نیاموں میں کر لو۔ بولو کتنی دولت چاہیئے۔

محمود : تم محمود کا ضمیر خریدنا چاہتے ہو جسے اس کائنات کی ساری دولت بھی نہیں خرید سکتی۔ میں بُت فروشی کے لیے نہیں، بُت شکنی کے لیے آیا ہوں۔ اگر تم سارے جہان کا خزانہ بھی میرے اور اپنے اس جھوٹے خدا کے درمیان حائل کر دو تو مجھے اپنے خدائے بزرگ و برتر کی قسم کہ میں یہ سب کچھ اپنے پاؤں تلے روند کر کفر و شرک کے اس مجسمے کو ریزہ ریزہ کر دوں گا۔

(بت پر زور زور سے ضربیں۔ پجاریوں کی چیخیں۔ مہا مہنت کی بار بار اُبھرتی ہوئی آواز۔ "سلطان! رُک جا! سلطان ٹھہر جا!" محمود کی مسلسل "نہیں۔ نہیں نہیں"۔ ضربیں مسلسل جاری رہتی ہیں۔ چیخیں برپا رہتی ہیں۔ چند لمحوں کے بعد ضربیں اور چیخیں رُک جاتی ہیں۔ محمود کی آواز بلند ہوتی ہے)

محمود : یہ ہے تمہارا مہا دیو اور مہا شکتی! ٹکڑے ٹکڑے، پاش پاش۔ ریزہ ریزہ اٹھاؤ ان ریزوں کو اور راستوں پر بکھیر دو۔ تاکہ خلقِ خدا کو معلوم ہو جائے کہ پتھر کے جس بے جان بت کو انہوں نے اپنا خالق اور رازق بنا رکھا تھا آج وہ پاؤں تلے پامال ہو رہا ہے۔ جھوٹے خداؤں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

(ذرا سا وقفہ۔ جس میں پجاریوں کے رونے کی تھمی تھمی آواز آتی رہتی ہے)

محمود : ایاز!

ایاز : حضور!

محمود : ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہیئے۔

(بگل کی آواز۔ گھوڑوں کی ٹاپیں۔ یہ ہنگامہ ختم جاتا ہے۔ اذان کی آواز بتدریج بلند ہوتی ہے۔ پھر دُور ہو جاتی ہے)

محمود : یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ لگتا ہے ہمارے اپنے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔

ایاز : آپ کی مسجد کے بلند مینار سے۔

محمود : مسجد مکمل ہو گئی ہے؟

ایاز : جی ہاں۔

محمود : ہم سب سے پہلے وہیں جائیں گے۔

(چند لمحے مکمل سکوت رہتا ہے پھر محمود کی آواز ابھرتی ہے)

محمود : بارِ الٰہا! بارِ الٰہا! تیرا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ تُو نے اپنے اس عاجز بندے پر بار بار فضل کیا۔ بار بار اپنی رحمت سے اسے نوازا!

پروردگارِ عالم! میری زبان میرے جذبات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اے قادرِ مطلق!
اپنے اس عاجز بندے کو توفیق دے کہ تیرا پیغام دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلائے۔
اے قادرِ مطلق! اے خدائے غفور الرحیم۔ اے خدائے رحمٰن و رحیم!

(فیڈ آؤٹ)